از سراج مغفور
۱۲ ذیقعدہ سنہ ۱۳۹۴ھ

ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمإ مسنون والجان خلقناه من قبل من نار السموم
القرآن الحکیم

تاریخ

قیام عالم و حیات آدم علیہ السلام

از

محمد سراج الحق مچھلی شہری

سابق لکچرار گورنمنٹ کالج الہ آباد

حسب ایماء حافظ عبد العلیم علیمی پسر مصنف مرحوم

منشی محمد ظہیر الدین ناظم

خورشید تاج کمپنی ناشر کتب دینیات الہ آباد

نے حلیۂ طبع سے آراستہ کرکے نذر ناظرین کیا

قیمت عہ

مصنفِ رسالہ کی چند دیگر تصانیف

۱۔ **ہفت قُلزم** :۔ حمد و نعت اور پانچ صحابہؓ کی منقبت در نظم اُردو۔ ان صحابؓہ کے لئے "آئینۂ حیات بیک نظر" کے نام سے ایک نقشہ بھی دے دیا گیا ہے جس سے کتاب میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ ۱۶ صفحات [زیرِ طبع]

۲۔ **اہلبیت اور اہلسنّت** :۔ اہلبیت رسولؐ کی بے مثل تحقیق اور اُن کے بارے میں اکثر اہلِ سنّت علماء کی غلطیوں پر تنبیہ۔ اصلاحِ عقائد میں بے مثل رسالہ تقریباً ۸۰ صفحات $\frac{۳۰ \times ۲۰}{۱۶}$ [زیرِ طبع]

۳۔ **الاذکار والاخلاق** :۔ اذکارِ سبعہ مسنونہ کے ذریعہ تزکیۂ اخلاق کا عجیب نبوی علاج۔ ایک علمِ عظیم اور قابلِ قدر رسالہ صفحات ۳۲ تقریباً [زیرِ طبع]

۴۔ **التوسّل والتسلسل** :۔ صوفیہ صافیہ کے شجراتِ مشائخ پڑھنے کی تحقیق مطبوعہ صفحات : قیمت ۵/

۵۔ **خُطَبُ العِرفانِ مِن شُعَبِ الایمانِ** :۔ ۷۷ شعبہائے ایمانیہ کی ۶۰۰ حدیثوں سے سال بھر کے جمعوں کے عربی خطبے۔ [زیرِ طبع]

عبد العلیم عیسیٰ پسرِ مصنف

باسمہٖ سُبحانہٗ و تعالےٰ

تمہید

یہ آج کی دنیا۔ ماشاءاللہ کیسی کچھ بسی سجائی، بھری پُری، حسین و رنگین، دلکش اور دلفریب ہے۔ اسکا وہ حصّہ جو قدرتی ہے اس کا تو خیر کہنا ہی کیا ہے۔ عالمِ صوت، عالمِ صورت، عالمِ رنگ، عالمِ بو۔ زمین، آسمان، پہاڑ، دریا، روشنی، تاریکی غرض ہر چیز بقول حضرت استاذی رحمۃ اللہ

؎ یہ حُسنِ دوست ہے اور التجائے جانبازی   تجھے یہ وہم کہ یہ کائناتِ عالم ہے؟ (اصغر گونڈوی)

واقعی جس جس چیز پر نظر پڑتی ہے بجز اس کے کہ انسان، انتہائے حیرت میں بے ساختہ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ کہہ اٹھے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا! خیر اگر آپ اس کو چھوڑ کر اس دنیا کے صرف اسی حصّہ کو لے لیجئے جو صنعتی ہے یعنی جس کا تعلق انسان کی فکر و نظر، سعی و عمل، ذوق اور پسند سے ہے تو اس کی بھی دلکشی کچھ کم نہیں ہے؟ وہاں بھی انسان قدم قدم پر بس یہی کہہ بیٹھتا ہے کہ:

؎ ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست (نظیری)

عمارات کی وہ رنگینی و سنگینی، ملبوسات و ماکولات کی وہ گوناگونی و بوقلمونی، ذرائع حمل و نقل کی وہ کثرت اور سُرعت، ایجادات کی وہ فراوانی و ارزانی، علوم و فنون کی وہ گہرائی و گیرائی! غرض کہاں تک کہئے اور کیا کیا بیان کیجئے! ہم ان سب کو روز دیکھتے ہیں روز برتتے ہیں اور کبھی کبھی ان پر حیرت بھی کر لیا کرتے ہیں لیکن شاید زندگی بھر میں ایکبار بھی اس پر غور نہیں کرتے کہ آخر اس خبر کا مبتدا کیا تھا؟ اور اس انجام کا آغاز کب سے اور کیونکر ہوا؟ کیا بزمِ عالم کی یہ تمام آرائشیں کسی وقت محض بخت و اتفاق سے اچانک ظاہر ہو پڑیں؟ کیا یہ وسیع عالم اور یہ آدم (جو خود بھی ایک مستقل عالمِ اصغر ہے) کسی صنّاعِ علیم و قدیر کی حکیمانہ صنعت کا نتیجہ نہیں بلکہ بے شعور مادہ کی بلا ارادہ کارفرمائیاں ہیں؟ خیر، اس آج کی صنعتی دنیا کے متعلق تو کچھ باتیں لوگوں کو معلوم بھی ہیں یعنی اس کے متعلق تو تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ دراصل اُس انسانیت کا بڑھاپا ہے جو اب سے تقریباً سات ہزار برس پہلے اس دنیا میں پیدا ہوئی تھی اور ایک بچّہ کے مختلف مراحلِ عمر کی طرح خود انسانیت کی یہ

پوری تاریخ بھی ولادت ، رضاعت ، طفولیت ، صبا ، مراہقت ، شباب ، کہولت ، شیخوخت کیفیت کے مراحل سے گزر چکی ہے اور اب آخری مرحلۂ فنا و موت کی طرف تیزی سے جارہی ہے ۔ یہی ایک انسانیت تھی جس نے غیبی اشارات اور عقلی تحقیقات کے دوگانہ اثر کے ماتحت ، موالید ثلاثہ اور عناصر اربعہ میں اپنے حواس خمسہ ظاہر و باطنی کی مدد سے اس شش جہت کے اندر وہ وہ صناعیاں اور گلکاریاں کی ہیں کہ ہفت اقلیم کو ہشت بہشت بناکر دھر دیا ہے کہ اب اگر نہ فلک اور دہ عقول بھی اس پر حیرت کریں تو جائے حیرت نہیں ۔ ان سات ہزار برسوں میں کیا کیا نہیں ہوا ؟ پانی کا سینہ چیرا گیا ۔ مٹی کا کلیجہ پھاڑا گیا ۔ ہوا کی زلفوں کی تلاشی لی گئی ۔ آگ کے انگاروں سے کھیلا گیا ۔ غرض اس عجائب خانۂ قدرت کے کونہ کونہ سے خواہش ، آسائش ، آرائش اور نمائش کا ریزہ ریزہ تنکا تنکا چن کر جمع کیا گیا ہے تب کہیں جاکر یہ آج کی متمدن دنیا اس قدر دلکش اور بارونق بن سکی ہے !!

یہی قدرتی دنیا ! تو اس کے متعلق تو کچھ بھی معلوم نہیں کہ یہ دنیا قدیم ہے یا حادث ؟ خالق ہے یا مخلوق ؟ اسکا مجموعہ یا اسکا کوئی جزو خود معبود مخلوقات ہے یا کسی معبود برحق کا بندہ و مصنوع ہے ؟ غرض صنعتی دنیا ہو یا قدرتی دنیا آج ہم اگر اس کی ابتدا کا کچھ حال معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے وجہ یہ کہ اس دشوار گزار راہ میں جن گروہوں سے ہم رہبری اور نور بخشی کی توقع کرسکتے تھے اتفاق سے وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے ۔ چنانچہ اہل تاریخ نے تو اس عہد کو " زمانہ قبل تاریخ " کہہ کر یکسر نظر انداز ہی کر دیا اور واقعی (اپنی تہیدستی اور کم مائیگی کے پیش نظر انھیں یہی کرنا بھی چاہئے تھا) اس کا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں ؟ اہل فلسفہ کا حال یہ ہے کہ عقل کی اندھیریوں میں کسی نے تو مادہ کو باشعور ، اور قدیم کہہ کر دل کا سکون اور مسئلہ کا حل حاصل کرنا چاہا مگر نتیجہ معلوم ! کسی نے ڈارون کے " نظریۂ ارتقا " ہی کو روشنی کا منارہ سمجھ لیا مگر انسان فانی ، اس کے نظریات بھی فانی ۔ سنا ہے کہ نظریہ ارتقا پر بھی اب موت کے آثار طاری ہیں اور اب کوئی دن جاتا ہے کہ یہ قدیم نظریہ " جینے ٹکس (Genetics) " کے جدید نظریہ کے لئے جگہ خالی کرنے والا ہے ، اس جدید نظریہ کا خلاصہ یہ ہے :

" انسان کسی جانور کی ارتقائی شکل نہیں بلکہ یہ اپنی ابتدائے آفرینش ہی سے انسان تھا ۔ "

اب رہ گئے " ارباب مذاہب " تو ان میں سے اکثر نے تو آفرینش عالم اور پیدائش آدمؑ کی روایات اور واقعات صحیحہ کو بہت کچھ تو بھلا دیا ہے اور بہت کچھ غیر معقول علم الاصنام کے افسانوں میں کچھ اس طرح گم کر دیا ہے کہ اب ان روایات کی نسبت نہ تو کسی بانی مذہب کیطرف کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے ، نہ اُس سے عقل کو سکون اور قلب کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے اور نہ اس سے کچھ انسان کا شرف اور اعزاز ہی سمجھ میں آتا ہے ۔ البتہ ایک " مذہب اسلام " نے ان روایات کا بڑا ذخیرہ محفوظ رکھا ہے ۔ آج جب اہل فلسفہ نے بھی " جینے ٹکس " کا نظریہ مان لیا ہے تو کیوں نہ اہل مذہب بھی " آفرینش عالم اور حیات آدمؑ " کے صحیح واقعات مرتب کریں ؟ میرے

نزدیک تو ہم کو بھی ضرور اس سلسلہ کی روایات کو درایت اور نقد کی کسوٹی پر کسنے کے بعد مرتب کرنا اور دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہئے۔

اہل اسلام کی ایسے وقت میں ایسی کوشش نہ صرف یہ کہ وقت کی ایک ضرورت پوری کرنا اور دنیا کو آفرینش عالم اور حیات آدم کے متعلق صحیح رہنمائی دینا ہے بلکہ اس طرح وہ ایک سعید فرزند کی طرح اپنے مورث اعلیٰ حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کی روحانیت کے سامنے خراج عقیدت بھی پیش کر سکیں گے۔

یہی کچھ سوچ کر ہم نے یہ رسالہ موسومہ بہ "قیام عالم اور حیات آدمؑ" چار ابواب پر مشتمل ترتیب دیا ہے جن میں سے ایک باب آفرینش عالم سے متعلق ہے اور تین ابواب حضرت آدمؑ کی حیات مبارکہ کے متعلق۔

نفس موضوع کے بیان سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اس علمی خدمت کے بارہ میں خود میں بھی کچھ عرض کر دوں!

۱۔ جس طرح شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلوی نے واقعات قیامت کی منتشر آیات و روایات کو قیامت نامہ میں ایک ترتیب سے جمع کر دیا ہے اسی طرح میں نے بھی ابتدائے آفرینش کی آیات و روایات کو اس رسالہ میں نقد و درایت کی روشنی میں اس طرح جمع اور مرتب کر دیا ہے کہ ابتدائے آغاز عالم کی ایک مسلسل تاریخ سی تیار ہو گئی ہے۔ اس سلسلہ کی کوشش کو تو اہل علم بھی نئی اور مفید کہیں گے ہاں مجھ جیسے کم علم سے اس کا حق ادا ہو سکنا معلوم!

۲۔ گو اس رسالے میں آفرینش عالم اور پیدائش آدم کے حالات اور واقعات کو احادیث ہی سے حاصل اور مرتب کیا گیا ہے لیکن خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے بعد بھی یہ کتاب تاریخ اور صرف تاریخ ہی کی ہے۔ احادیث سے ماخوذ دیکھ کر اس رسالہ کے (خصوصاً فصل اول کے) مضامین کو عقیدہ کا درجہ نہ دینا چاہئے۔ عقیدہ حاصل ہوتا ہے سنت سے۔ عقیدہ عام احادیث سے نہیں حاصل ہوتا۔ حدیث تو ہر ارشاد نبی۔ عمل نبی۔ قول صحابی کو عام ہے خواہ اس میں احکام کا ذکر ہو خواہ قصص و اخبار کا۔ یا سیرت و مغازی کا۔ شعر و ادب کا یا تاریخ بلاد و تاویل رویا کا لیکن سنت خاص وہ احادیث کہی جاتی ہیں جو قوی اور اقوی۔ صحیح اور اصح ہوں قطعی الدلالۃ ہوں قطعی الثبوت ہوں۔ تاریخ میں قوی اور قطعی احادیث کی ضرورت نہیں۔ تاریخ میں اگر ضعیف روایات پر بھی اعتماد کیا جائے جیسے اسی رسالہ میں اکثر روایات ضعیف سے کام لیا گیا ہے تب بھی عام تاریخ سے یہ زیادہ معتبر چیز ہوگی۔ پس اس رسالہ کے (فصل اول کے) حالات پر تاریخی عقیدہ اور تاریخی یقین تو کیا جائے لیکن اسے دینی عقیدہ اور مذہبی یقین کا درجہ نہ دیا جائے۔

۳۔ میں نے اس مضمون میں اکثر مقامات پر بعض قدم اور بعض حال کے اکابر کی آراء و توجیہات

سے اختلاف بھی کیا ہے مگر بحمد اللہ اکابر کی حرمت اور قدر شناسی تو برابر ملحوظ رکھی ہے البتہ اپنی رائے اور توجیہہ کا اظہار مع دلیل کے کر دیا ہے اور ایسا اختلاف شاید "اختلاف امتی رحمۃ" کی بشارت میں داخل ہو۔

۴۔ میں نے واقعات کی بنیاد تو روایات، حدیث ہی پر رکھی ہے مگر چونکہ تفاسیر میں روایات ہر طرح کی ہیں اور اسی طرح مفسرین کے تشریحی اقوال بھی بے حد ہیں جن میں سے بعض کو پسند و اختیار کرنے سے عقل ابا کرتی ہے اس لئے ترجیح روایات اور انتخاب اقوال میں پھر اقوال کی توجیہہ و تاویل میں نیز واقعات کی تقدیم و تاخیر و ترتیب و تعبیر میں احقر نے اپنی فہم اور اپنے ذوق پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ اگرچہ رد و قبول اور ترتیب و تعبیر کا یہ عمل بظاہر ایک بے جا جسارت معلوم ہوگا لیکن میں نے ہر جگہ یہ معیار بڑی سختی سے پیش نظر رکھا ہے کہ "کوئی بات مسلمات دین اور منشاء رسول کے مخالف و مصادم نہ ہو نہ عمداً نہ سہواً" بس مسلمات دین کے موافق ہونے کے بعد پھر توضیح و تعبیر کے میدان میں میرے نزدیک توسع ہے یعنی پھر مجھے اس کی فکر نہیں ہوتی کہ میری رائے سب سے الگ نہ ہو جائے۔

بہر حال ظن غالب اور احتمال قوی تو اسی کا ہے کہ اس سلسلے میں مجھ سے لغزش اور غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی اور جو اہل علم از راہ کرم مجھے میری غلطیوں پر متنبہ فرمائیں گے میں ان کا ممنون ہوں گا۔ لیکن اگر اس تمام کاوش میں کوئی نادر نکتۂ علمی نظر آئے — اور اللہ تعالیٰ کی قدرت تام اور عطائے عام سے وہ بھی بعید نہیں — تو وہ قرآن کے غیر منقضی عجائب میں سے اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو بواسطہ حضرت برزخ وقت مصلح امت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب مدظلہ و دامت برکاتہم کے اس ناکارہ کو بھی عطا ہوئی ہے وللہ در من قال:

"کیمیائے است عجب بندگی پیر مغان
خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند"

فللہ الحمد اولاً و آخراً

عبد محتاج - سراج غفر لہ

ھُمُو ناقدی اذروا العتابَ — وقولوا ان اصبتُ لقد اصابن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب اوّل — عالمِ قبلِ آدمؑ

قرآن شریف
وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰہُ مِیۡثَاقَ النَّبِیّٖنَ ..... (اِلٰی) ... فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۝ (آل عمران)

حدیث شریف
(ابو رزین العقیلی) قُلۡتُ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ! اَیۡنَ کَانَ رَبُّنَا قَبۡلَ اَنۡ یَّخۡلُقَ خَلۡقَهٗ قَالَ کَانَ فِیۡ عَمَاءٍ. مَا تَحۡتَهٗ هَوَاءٌ وَّمَا فَوۡقَهٗ هَوَاءٌ وَّخَلَقَ عَرۡشَهٗ عَلَی الۡمَاءِ (رواہ الترمذی)

موجودہ توریت
"ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔ اور خدا نے کہا کہ اجالا ہو اور اجالا ہو گیا۔ اور خدا نے اجالے کو دیکھا کہ اچھا ہے اور خدا نے اجالے کو اندھیرے سے جدا کیا اور خدا نے اجالے کو دن کہا اور اندھیرے کو رات۔ سو شام اور صبح پہلا دن ہوا۔ اور خدا نے کہا کہ پانیوں کے بیچ فضا ہووے اور پانیوں کو پانی سے جدا کرے۔ تب خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانیوں کو فضا کے اوپر کے پانیوں سے جدا کیا اور ایسا ہی ہو گیا" (پیدائش آیات ۱-۷)

منوشاستر
"پہلے ایسا اندھیرا تھا جس کا بیان نہیں ہو سکتا تب ایشور نے پرتھوی ظاہر کرنے کے لئے مہاتت اور بھوت وغیرہ کی صورت میں ظہور کیا۔ تب برہما نے خلقت کو پیدا کرنے کا ارادہ کر کے اوّل جل پیدا کیا اور اس میں اپنی منی ڈالی جس سے سونے کا انڈا پیدا ہوا۔ اس میں آپ برہما ہو کے پیدا ہوا۔" (تفسیر حقانی دوم ص۱۲۱ بحوالہ منوشاستر)

تمہید میں نے مناسبت مقام کے لحاظ سے آفرینش عالم کا بیان حدیث شریف کے علاوہ توراۃ اور منوشاستر سے بھی نقل کر دیا ہے تاکہ ان کے باہمی موازنہ و مقابلہ سے معلوم ہو سکے کہ یہ بیان کن کن نقاط میں یکساں ہے؟ کہاں کہاں کس قدر اور کس قسم کا اختلاف ہے؟

قرآن شریف کی کوئی آیت بعینہٖ اس مضمون کی مجھے نہیں مل سکی جس کا ذکر حدیث شریف اور توراۃ کی عبارتوں میں ہے ایک آیت کا ایک ٹکڑا "وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاۗءِ" ضرور ملا مگر وہ میرے مقصد کے لئے کافی نہ تھا اس لئے میں نے ایک دوسری آیت لکھی ہے جس میں بالکل آغاز آفرینش کا تو نہیں البتہ کچھ بعد کا ایک مہتم بالشان واقعہ کا بیان ہے۔ ترجمہ آگے آرہا ہے بہرحال اب میں حدیث شریف سے اپنا مضمون شروع کرتا ہوں:

شانِ اوّل یا مرحلہ اوّل

۱۔ حضرت ابو رزین عقیلی صحابی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہ! ہمارا پروردگار اپنی مخلوقات کے پیدا کرنے سے قبل کہاں تھا؟ آپ نے فرمایا "عما" میں تھا کہ نہ اس کے نیچے ہوا تھی نہ اس کے اوپر ہوا تھی اور اس نے پانی پر اپنا عرش[1] پیدا کیا۔" (ترمذی) اس میں حضورؐ نے تین باتیں فرمائی ہیں ایک[1] یہ ہے کہ مخلوقات کی پیدائش سے پہلے صرف خدا کی ایک اکیلی ذات تھی اور کچھ نہ تھا ایک اور حدیث میں حضورؐ نے ذرا اور وضاحت سے یوں فرمایا ہے کہ كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ قَبْلَهٗ شَيْءٌ (مشکوٰۃ) یعنی پہلے بس اللہ تعالیٰ کی ایک اکیلی ذات تھی اور اُن سے پہلے

---

[1] ابن کثیر اور روح المعانی میں آیت "وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاۗءِ" (ھود) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پانی کے دو حصے کئے۔ ایک حصہ کو عرش کے نیچے رکھا جس کا نام اَلْبَحْرُ الْمَسْجُوْرُ ہے اور دوسرا حصہ زمینوں کے نیچے رکھ دیا" میں کہتا ہوں کہ توراۃ کی مذکورہ بالا ساتویں آیت میں جن دو پانیوں کا تذکرہ ہے وہ غالباً یہی ہے۔ عرش کے نیچے پانی کا جو حصہ ہے شاید لامکان اور لاہوت اسی کی دوسری تعبیریں ہوں وہ پانی کا بہترین حصہ تھا واللہ اعلم ۱۲ منہ عرش گو ایک مخلوق ہے مگر اسکا تعلق ذاتِ بحت (نرگن) سے کچھ ایسا اہم ہے کہ دیگر مخلوقات سے بہت قبل اس کو پیدا فرمایا گیا۔ روح المعانی سورہ ص میں ہے کہ "عرش اُن چاروں چیزوں میں سے ایک ہے جسے حق تعالیٰ نے اپنے دستِ مبارک سے (اہتمام سے) پیدا فرمایا ورنہ بقیہ کل موجودات کو محض کلمہ "کُن" کہہ دیا اور وہ سب موجود ہو گئیں" اس لئے میرا مشورہ ناظرین کو یہ ہے کہ عرش اور اُس پانی کو "دینی متشابہات" اور "بنیادی مبہمات" میں شمار کیجئے اور ان کی کنہ و ماہیت پر زیادہ غور نہ کیجئے ع کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را ۱۲

دیا اُن کے سامنے) کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ دوسری[٢] بات یہ فرمائی کہ خُدا عما میں تھا عما کی تشریح ذرا تفصیل طلب ہے اس کا ایک مفہوم تو بادل کا ہے تو معنی یہ ہونگے کہ خدا بادل[٥] میں تھا مگر چونکہ خدا کے سوا کوئی دوسری چیز تھی ہی نہیں اس لئے یاد رکھنا چاہئے کہ بادل کا الگ کوئی وجود نہ تھا بلکہ خدا تعالیٰ کی ذات جو سمجھ میں نہیں آسکتی بس کچھ ایسی حالت میں تھی جس کو فہم سے قریب کرنے کے لئے بادل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے خیر یہ معنے اس لحاظ سے تو ضرور مناسب ہیں کہ اکثر مواقع پر ذات حق کے ذکر کے ساتھ ایک "بادل" کا ذکر اکثر آیات و روایات میں آتا ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سفارش پر بنی اسرائیل کے ستر نقبا سے جب کلام فرمایا تو بادل ہی کے حجاب سے گفتگو فرمائی اور قیامت میں حساب کیلئے تشریف آوری بھی بادل (غمام) کے حجاب میں ہوگی مگر میرے نزدیک اسکا دوسرا مفہوم خلا۔ عدم۔ اندھیرے کا مراد لینا زیادہ مناسب ہے یعنی عما سے ایسی منظری کیفیت مراد ہو کہ خلوت و تنہائی بھی ہو کہ کوئی دوسرا موجود نہ ہو اور وقت بھی کچھ ایسا ہو جیسے صبح کے منہ اندھیرے اور جھٹ پٹے کا ہوتا ہے کہ نہ تو اندھیرا ہی ہو اور نہ تیز روشنی۔ اندھیرا تو اس لئے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات نور ہی نور ہے۔ جہاں وہ ہوں وہاں اندھیرے کا کیا ذکر؟ اور تیز روشنی اس لئے نہیں کہ روشنی کی ضرورت تو اشیا کو ایک دوسرے سے امتیاز کرنے اور اشخاص و اشیاء کو دیکھنے اور پہچاننے کیلئے ہوتی ہے۔ اور جب وہاں غیر خُدا کچھ تھا ہی نہیں تو تیز روشنی

---

۵ بادل: آج بعض اہل سائنس تو عالم کی آفرینش الکٹرون نامی ایک توانائی (Energy) سے بتاتے ہیں لیکن ان کے مقابلہ میں بعض دوسرے اہل سائنس اپنی زندگیاں صدیوں تک سائنسی دریافتوں میں خرچ کرنے کے بعد یہ دریافت کر سکے ہیں اور اس پر بہت نازاں بھی ہیں کہ "نظام عالم جب بنا تھا اسوقت کوئی چیز ہلکی بھاپ یا کہر کے قسم کی عالم میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور اب بھی پھیلی ہوئی ہے جسے "نیبولا" کہتے ہیں۔ یہ دوسرا قول اگر درست مانا جائے تو قابل توجہ بات یہ ہے کہ عرب کے نبی اُمّی صلے اللہ علیہ وسلم نے بلا محنت و وقت کے یہ نادر انکشاف عرب کے بادیہ نشینوں میں ایک منٹ کے اندر فاش فرما دیا۔ خیر اگر بات یہیں تک رہتی تو ہم بھی اہل سائنس کو سراہتے کہ انھوں نے کسی طرح سے سہی (یعنی اہل مذہب ہی سے کچھ سن گن اور اتا پتا پاکر یا اپنی کوشش سے) ابتدائے آفرینش میں کہر۔ بھاپ کا انکشاف و اعتراف تو کیا جو مذہبی اطلاع کے موافق ہے بس اب ان کو صرف خدا کا اعتراف کرنا باقی رہ گیا ہے لیکن وہ تو ایک قدم آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بھاپ یا کہر کو معرفت خدا کا ذریعہ ماننے کو تیار نہیں بلکہ وہ خدا کے مقابلہ میں ایک دوسرا خدا (مادّہ) ماننا چاہتے ہیں جو قدیم اور اشیاء عالم کا خالق ہے فسبحان اللہ عما یشرکون ۱۲۵

بے ضرورت ہوتی! - اسی مفہوم کو اندھیرے سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس تعبیر میں منو شاستر اور توریت بھی متفق ہیں ۔ بعض نے عما کا مطلب "عدم غیر" لیا ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ عما کا مفہوم اگر خفا کا لیا جائے تب تو پھر اس حدیث کے مفہوم میں کسی قسم کا خفا ہی نہیں رہ جاتا اس صورت میں عما کی تفسیر ایک دوسری حدیث سے بھی ہو جاتی ہے ۔ حدیث مشہور ہے "کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً" یعنی قبل تخلیق مخلوقات، حق تعالیٰ ایک خزانہ تھے جو خفا میں تھا۔ والحمد للہ علیٰ ھٰذا العلم ۔ بہر حال خدا کے عما میں ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ مخلوقات کی پیدائش سے پہلے حق تعالیٰ کی ذات بالکل اکیلی تھی اور دوسری کوئی چیز نہ تھی عرش بھی نہ تھا وہ پانی بھی نہ تھا حق تعالیٰ کی جملہ صفات کمال بھی خفا میں تھیں اور عالم یا اشیاء وغیرہ کے بجائے خلاء وعدم تھا مگر چونکہ انسانوں کے لئے خلا کا تصور دشوار تھا حتیٰ کہ بعض نے خلا کو محال کہہ دیا اس لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ توضیح بھی فرما دی کہ" نہ اس کے اوپر ہوا تھی اور نہ اس کے نیچے ہوا تھی بس خلا ہی خلا ۔ خفا ہی خفا اور عدم ہی عدم تھا" چونکہ عقل انسانی اس سے زیادہ حق تعالیٰ کی ذات کو سمجھنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اس لئے حضرت شارعؑ نے اتنی اطلاع دے کر مستقل طور پر ممانعت فرما دی "لَا تَفَکَّرُوا فِی ذَاتِ اللہِ" اللہ کی ذات پاک کے بارہ میں زیادہ غور و فکر ہرگز نہ کرنا" تیسری بات حضور نے یہ فرمائی کہ" خدا نے پانی پہ اپنا عرش (تخت) پیدا کیا"۔ اس میں جس پانی کا ذکر فرمایا ہے وہ کوئی خاص پانی تھا۔ یہ آج کا مادی پانی نہ تھا وہی پانی اُسوقت کی کائنات اور خدا کی سلطنت تھا۔ بہر حال یہ عما (بادل ۔ کہر ۔ دھندلکے ۔ خلاء ۔ خفا ۔ عدم غیر) کی کیفیت پہلی شان تھی یہ شان نہ معلوم کب سے چلی آتی تھی اور نہ معلوم کتنی مدت تک رہی ۔ اسوقت حق تعالیٰ کو یہی محبوب تھا کہ تنہا رہیں ایک زمانہ تک عما اور خفا کی شان رہی پھر شان بدلی اور ایک خاص پانی اور عرش پیدا ہوا۔ ہم اس کو بھی شان اول میں داخل سمجھتے ہیں بہر حال اس شان کے اندازہ کے لئے ہزار اور لاکھ برس کے قیاسات محض فضول ہیں اس کی صحیح ایمانی تعبیر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیش اور ازل الآزال سے موجود ہے عدم نہ اس پر طاری ہوا اور نہ اس پر سابق ہوا

جَلَّ جلالہٗ وعزَّ شانہٗ۔

۲۔ دوسری شان یا دوسرا مرحلہ

اب حق تعالیٰ کی تجلّیاتِ جمال اور تعلّیاتِ کمال نے ظہور کا اور پہچانے جانے کا خود تقاضا کیا اور حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ شان تبدیل ہو۔ یہ پہلا تقاضائے ظہور تھا اس کا ذکر اس مشہور حدیث قدسی میں ہے کہ "کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ" (یعنی میں پہلے ایک خزانہ کثیر المنفعت تھا مگر وہ سارا نفع بالکل پردۂ خفا میں تھا کیونکہ میرے سوا کسی کا وجود ہی نہ تھا) تو میں نے خود ہی چاہا کہ کوئی دوسرا ہو جو مجھے پہچانے اور میرے منافع گوناگوں سے مستفید ہو تب میں نے تمام مخلوقات کو (اپنی قدرت سے اپنی حکمت کے مطابق درجہ بدرجہ ترتیب وار) پیدا کیا۔ گویا حق تعالیٰ کے حُسن و جمال۔ جود و نوال کرم و کمال نے مزید اور خفا اور عما کی حالت میں رہنا خود گوارا نہیں کیا اور ظہور و نمود کے لئے تقاضا کرنا شروع کیا: خوب کہا ہے شاعر نے: ع وہ اپنے حُسن کی مستی سے تھے مجبورِ پیدائی (اقبال) ع وہ ہر جزو جلوۂ یکتائی معشوق نہیں۔ ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں (غالب) ع سر آج! اک شمع کا ہونا ہی رونق کو نہیں کافی۔ بہنوں جلنے کو پروانے تو کیا گرمیٔ محفل ہے۔ (سراج مخفرلہٗ)

بہرحال جس طرح دنیا میں کاروبار چلانے، چیزوں کے دیکھنے اور ان میں سے ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنے کے لئے ہر روز ہی "نورِ ظہور" کے وقت دھندلکا دور ہونے لگتا اور رفتہ رفتہ روشنی بڑھنے لگتی ہے اُسی طرح آفرینشِ عالم کے اس دوسرے مرحلہ پر بھی وقت آگیا کہ "ظہورِ نور" ہو بلکہ یوں سمجھو کہ یہ جو ہر روز صبح کے جھٹ پٹے کے بعد ہی روشنی پھیلتی اور من و تو کا امتیاز کراتی ہے یہ خود دراصل اس کی نقل ہے کہ آفرینش کے آغاز میں پہلے تو عالم عما تھا اور پھر امتیاز و معرفت کیلئے نور پیدا ہوا اور پھیلا اُسی طرح اس مرحلہ پر خدا نے چاہا کہ نور بڑھے۔ پہچاننے والے بھی موجود ہوں اور وہ پردہ نشینِ ازل۔ وہ خلوت گزین تھا اور وہ قدیم کنزِ مخفی پہچانا جائے اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے نورِ مطلق سے پہلے تو نورِ محمدی

کو پیدا فرمایا جس کا ذکر حدیث[1] میں مختلف الفاظ کے ساتھ وارد ہے مثلاً اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ (یا) اَلْخَلْقُ کُلُّھُمْ مِنْ نُوْرِیْ (یا) یَا جَابِرُ! اِنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ خَلَقَ نُوْرَ نَبِیِّکَ مِنْ نُوْرِہٖ قَبْلَ الْاَشْیَاءِ [او کما قال] جس کے ترجمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور[2] تمام چیزوں سے قبل پیدا فرمایا۔

---

[1] اس قسم کی حدیث کی صحت اور قوت کا حال تو محدثین کرام جانیں مگر میں تو عقلاً بھی اس مضمون کو صحیح اور ضروری سمجھتا ہوں اور نقلاً بھی۔ نقل میں میرا استدلال یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ اس میں حصر کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ تخلیق ثقلین کا اصل باعث عبادت اور عبدیت ہے اور معلوم ہے کہ عبادت، کمال عظمت اور کمال محبت کے مجموعہ کا نام اور حضرت ختم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقام ہے اسی عبدیت کی دوسری تعبیر عشق ہے جو حسن ازل کا صحیح مقابل نورِ حق سے جلنے والا پہلا چراغ، مخلوقات میں سب سے اول مخلوق تھا۔ خوب کہا ہے استاد مرحوم نے سہ
اے حسن ازل! اپنی اداؤں کے مزے لے ؛ ہے سامنے آئینہ حیرانِ محمدؐ ۔ رہا عقلاً تو میں اس کو یوں سمجھتا ہوں کہ اس سے قبل کی حالت تھا وخفا کی۔ خلا اور عدم غیر کی۔ دھندلکے اور اندھیرے کی تھی اب دوسری شان میں خفا کی جگہ ظہور۔ خلا وعدم غیر کے بجائے وجود مخلوق اور اندھیرے کی جگہ نور پیدا ہوا اور اسلئے پیدا ہوا کہ دوسرا کوئی ہو جو خدا تعالیٰ کو پہچانے۔ عشق ہو جو حسن کی قدر کرے۔ اپنے لئے جب خدا نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو حق کی یہ معرفت بھلا بغیر نور محمدی کے ہو بھی کیسے سکتی تھی ۱۲ سراج[2] جب نور محمدی سے قبل دو مخلوق (عرش اور ماء) اور بھی تھیں تو اس نور کے لئے اول خلق فرمانا بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتا تو جواب یہ ہے کہ یہ اولیت اضافی ہے چونکہ بعد کی مخلوقات کے مقابلہ میں یہ نور اول تھا اس لئے اسے خلق میں اول کہنا بھی صحیح ہے ہم روزمرہ بولتے ہیں مثلاً یہ کہ "جب میں وہاں پہونچا تو میں نے سب سے پہلے تمہاری سفارش کی" حالانکہ ایک مسلمان دوسرے سے مل کر پہلے سلام کرتا ہے پھر مزاج پرسی کرتا ہے اس کے بعد پھر کوئی دوسری بات سفارش وغیرہ کرتا ہے تو مطلب یہ ہے کہ سلام ومزاج پرسی ودیگر رسمی باتوں کے بعد بقیہ باتوں سے قبل میں نے تمہاری سفارش کی یہی تاویل ان متعدد احادیث میں بھی ہوگی کہ کسی میں حضورؐ نے عقل کے لئے اور کسی میں قلم کیلئے بھی "اوّل ما خلق اللّٰہ" فرمایا ہے (دیکھو جمع الفوائد دوم باب بدء الخلق) = البتہ بعض جگہ ایک دوسری بھی تاویل یہ بھی کی جائے گی کہ وہاں ظرفیت کی بنا پر اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ (اول کو فتحہ) پڑھا جائیگا مثلاً قلم کے متعلق فرمایا "اول ما خلق اللہ القلم قال لہ اکتب" ترجمہ یہ ہوگا کہ جیسے ہی خدا نے قلم کو پیدا کیا کہ اس سے فرمایا لکھو ۱۲ سہ اللہ کا نور قدیم غیر مخلوق ہے اور نور محمدی مخلوق ہے اور نور خداوندی کا ظل اور عکس ہے خوب سمجھ لینا چاہئے پس اس سے اتحاد۔ حلول۔ جزئیت وغیرہ کا مطلب نکالنا تحریف اور کفر ہے ۱۲

[انتباہ] نور محمدی اور حقیقت محمدی مبہم اور مُوہِم الفاظ ہیں انکی کچھ توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ دونوں الفاظ حق تعالیٰ ہی کی ایک اعلیٰ اور جامع ترین صفت کے دوسرے نام ہیں ان کے معنے و مفہوم در اصل یہ ہیں کہ "وہ نور خداوندی جو ہر لحاظ سے محمود۔ محمد اور قابل تعریف تھا"۔ جس مرحلہ پر یہ نور پیدا فرمایا گیا اُس مرحلہ پر عقلی ضرورتیں دو تھیں ایک یہ کہ کوئی غیر بھی موجود ہو جو حق تعالیٰ کو پہچان سکے اور کامل طور پر پہچان سکے اور دوسری یہ کہ وہ غیر خود بھی قابل تعریف ہو جامع اعلیٰ اور کامل ہو کیونکہ مشیتِ الٰہی میں اسی کو آئندہ مخلوقات کا مصدر و مرکز بنایا جانیوالا تھا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو بجز خود حق تعالیٰ کے کوئی دوسرا پہچان نہیں سکتا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے چنانچہ کامل ترین انسان یعنی حضرت سرور کائنات اشرف الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ اور مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ فرما کر اس حقیقت کی تصدیق و توثیق فرما دی حالانکہ آپ نے تمام ملٰئکہ و جن و انس سے بہت زیادہ حق تعالیٰ کو پہچانا تھا۔ پس ادھر تو اللہ تعالیٰ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں پہچانا جاؤں اور ادھر وہاں کوئی دوسرا تھا بھی نہیں جو حق تعالیٰ کو پہچان سکے نتیجہ اس کے سوا کوئی دوسرا نکل نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ہی ایک اعلا اور قابل تعریف صفت پیدا کی اور خود اپنے مقابل رکھ لی کہ وہی حق تعالیٰ کی ذات و صفات کو دیکھے وہی پہچانے اور قدر کرے جیسے بلا نیتِ تشبیہہ کوئی حسین خود اپنے حسن و جمال کو دیکھنا، جزئیات حسن پر تفصیلاً نظر کرنا، اس نظارہ سے خود ہی لطف اندوز ہونا چاہے تو اپنے سامنے آئینہ رکھ لیتا ہے اور اپنے جمال اور کمال کی کامل معرفت حاصل کرتا ہے اور اس میں کچھ دیر محو رہتا ہے۔ بہر حال ذاتِ حق تو خفا میں تھی ہی اب تک صفات حق بھی خفا میں تھیں [شاید اسی مرتبہ کا نام فلاسفہ و متکلمین کے یہاں ذاتِ بحت اور ہنود کے یہاں نرگُن ہے] لیکن اب یہ دوسرا مرحلہ وہ ہے کہ صفتِ اوّل کا ظہور ہوا جسے ہنود سرگن (ذات مع الصفت) کہتے ہیں = چونکہ ان امور کے متعلق شریعت حقہ زیادہ غور و فکر سے منع کرتی ہے اور یہ اُس کا بہت بڑا احسان ہے کیونکہ عقول کو

نہ ان کا تحمل ہے اور نہ زیغ و خطا سے امن، اسلئے بس یہ مصرعہ پڑھ کر ذہن کو کند اور زبان کو بند کر لینا ہی اصل ایمان ہے کہ:

آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ
؎ آہ! ناظر وہ خود ہے خود منظور!

اب رہی دوسری بات کہ وہ نور فی نفسہٖ بھی قابلِ تعریف ہونے میں اعلا اور کامل ہو کیونکہ آئندہ چل کر اسی کو لاتعداد مشتقات کا مصدر بننا تھا تو یاد رکھنا چاہئیے کہ وہ اگرچہ پہلا مخلوق اور پہلا نمونہ تھا مگر چونکہ قادرِ مطلق خدائے برتر کی قدرت و صنعت سے تھا اس لئے وہ شاہکار اور قابلِ حمد تھا بے مثل اور بے نظیر تھا۔ وہ نور تھا جامع، کامل اور محمود = یہ صورت کہ پہلا نمونہ تھا اس لئے کچھ خراب بنتا اور باوجود ارادہ و کوشش کے بھی خراب بنتا وہاں محال تھی اسلئے کہ یہ صورت عاجز انسان کی صنعت میں تو ممکن ہے مگر خدا کی صنعت میں محال۔ اس نے جب اپنے کمالِ قدرت کو ظاہر کرنا چاہا تو پوری قدرت اور پوری حکمت، پورے اتقان اور پورے اطمینان سے اپنے پہلے ہی نمونہ کو اپنا شاہکار بنایا۔ پھر چونکہ خدا تعالےٰ کو منظور یہ تھا کہ کیا بہ لحاظِ کمالِ معرفتِ حق اور کیا بلحاظِ کمالِ حسنِ خُلق و حسنِ خَلق غرض ہر طرح سے کامل ترین اور ہر لحاظ سے سب سے زیادہ قابلِ تعریف بشر صرف ایک ہی ہستی کو بنایا جائیگا جو عرب کے ہاشمی گھرانہ میں خواجہ عبدالمطّلب کے دلبند اور خواجہ عبداللہ کے فرزند ہوں گے اسلئے اللہ تعالےٰ نے اپنی صفت محمدیت کے اندر مرتبۂ جمع ہی میں اشیاء و اعیان کی پیدائش سے بہت قبل بلکہ ارواحِ انبیاؑ کی تخلیق سے بھی قبل حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہستی بجویز و تعیین فرمائی اور اسی مرتبۂ جمع میں اُس ہستیٔ مجوزہ کو دیکھ لیا اور ان کو مخاطب بنا کر فرمایا "لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الدُّنْیَا" (ابن عساکر) یعنی خدا تعالیٰ نے فرمایا اے ہستیٔ محمدی چونکہ میں اپنی صفتِ محمدیت کا سب سے بڑا مظہر، اور اپنی جامعیت کا سب سے بہتر نمونہ آپ کو بنانا چاہتا ہوں اپنی اس صفت سے خاص اور اخص اور اقرب ترین نسبت آپ کی ذات میں رکھنا چاہتا ہوں اس لئے اگر آپ نہ ہوتے بالفاظِ دیگر یہ کہ اگر مجھے خود اپنی یہ جامع اور اعلا ترین صفتِ محمدیت

ظاہر کرنی نہ ہوتی تو میں اس ساری دنیا کو کبھی پیدا نہ کرتا مجھے اس دنیا کے پیدا کرنے سے کھیل تماشا یا تفریح مقصود نہیں کہ گھٹیا چیز پیدا کرتا میں تو اپنی شان کے مناسب اپنی ایسی صفت ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو ہر طرح کامل اور اعلا ہو اور اسلئے قابلِ حمد ہو لہذا تخلیق کے موجودہ مرحلہ میں تو میں اپنی صفت محمدیت کو پیدا کر رہا ہوں ہاں عالم عنصری و نشاۃ صوری میں اسکا مصداق آپ کو پیدا کرونگا کیونکہ اس کے مظہر اتم اور مصداق وحید آپ ہوں گے [چنانچہ حکمتِ الٰہیہ میں اس اکمل ترین بشر کے ظہور کا جو وقت مقرر تھا جب وہ وقت آیا اور خواجہ عبداللہ ہاشمی کے گھر میں فرزند سعید تولد ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی اسی صفتِ محمدیت کی یادگار میں اُن کا نام محمد ہی رکھوایا صلی اللہ علیہ وسلم] پس حدیث قدسی میں حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ اے محمد چونکہ مجھے اپنی یہ صفت ظاہر کرنی تھی اور اس کے تقاضے سے ہر چیز عالم ہو کے اندر اور عالم بشریت میں آپ کے اندر اپنی اسی صفت کو نمایاں کرنا تھا اس لئے میں نے یہ دنیا پیدا کی ۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم وبہ اعوذ من الزیغ والتہور

(ف) نور محمدی چونکہ ایک مخلوق ہے اس وجہ سے اس کے متعلق (اور اس کے بعد کے مراحل ایجادات کے متعلق) البتہ ظن وتخمین کو مدت اور فاصلہ کے انداز کے لئے کچھ مجال دیجا سکتی ہے بشرطیکہ احادیث میں کوئی وضاحت مدت کے متعلق وارد نہو نیز مدت کے بارہ میں سوال کرنا جواب دینا اور مدت وارده پر یقین کرنا سب درست ہوگا یعنی اگر حدیث میں مدت وارد نہو تو رجماً بالغیب کوئی مناسب مدت مقرر کر لینا بھی ممنوع نہیں ۔ اگرچہ یہ بھی محض اٹکل پچھو تیر چلانا ہوگا اس میں قطعیت نہو گی اور نہ کسی کے لئے اسکا ماننا حجت ہوگا لیکن ذوق کو تسکین ہو جائیگی لیکن نور محمدی سے قبل کے مرحلہ (مرحلہ عماء و خفاء و کنز مخفی) کے متعلق عقل و ادراک، ظن وتخمین، غور و فکر، سوال وجواب، یا کچھ سوچنا اور کچھ کہنا سب "ذاتِ حق میں تفکر" ہونے کے باعث ۔ گناہ، منع اور ناقابلِ معافی جسارت ہے اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْہُ ۔ چونکہ نور محمدی کے متعلق کوئی حدیث نہیں یا میرے علم میں نہیں

آسکی) اس لئے اس قیاس پر کہ اس کے بعد کے بعض مراحل کیلئے حدیث میں "پچاس ہزار برس" کی مدت کا ذکر آیا ہے اس لئے اگر آپ کا جی چاہے تو ذہن کی تسکین کے لئے اس نور محمدی کے مرحلہ کی مدت بھی (تیسرے مرحلہ کے ظہور سے قبل تک) "پچاس ہزار برس" فرض کر لیجئے۔ اسکے بعد شانِ حق جل وعلا" بحکم کل یوم ھو فی شان "پھر تبدیل ہوئی

۳۔ مرحلہ سوم یا تیسری شان

اس کے بعد حق تعالےٰ کی شان نے پھر تبدیل ہونا چاہا اور اس کی تجلیاتِ جمال اور تعلیاتِ کمال نے مزید ظہور کا تقاضا کیا (اور یہ دوسرا تقاضا تھا) تو حق تعالےٰ نے اُس نور محمدی سے ایک جوہر[1] (اور بروایتے دیگر ایک سبز یاقوت) پیدا فرمایا اور اسپر ہیبت و جلال کی ایک نظر ڈالی جس سے وہ پگھلنے لگا" پھر حق تعالیٰ نے اُس کے دس حصے فرمائے ایک حصہ سے قلم[2] دوسرے سے لوح محفوظ۔ تیسرے سے کرسی۔ چوتھے سے ملاء اعلےٰ[3] کے فرشتے (حضرات جبرئیل و میکائیل و عزرائیل و اسرافیل علیہم السلام اور ہر ایک کے ساتھ ان کے محکموں کے بیشمار فرشتے) پانچویں

---

[1] روح المعانی سورۃ ہود۔ مدارک حٰم سجدہ۔ یہاں ایک بعید سا گمان یہ ہوتا ہے کہ روایات اسلامی میں تو اس مرحلہ میں جوہر کا ذکر کیا ہے۔ شاید یہ وہی چیز ہے جس کی تعبیر منو شاستر میں "سونے کا انڈا" سے کی گئی ہے اور چونکہ اس مرحلہ سے تخلیق کا کاروبار شروع ہوتا ہے اس لئے اس کی تعبیر کے لئے منی کا ذکر اس میں لاتے ہیں۔ پھر برہما کی پیدائش کا جو ذکر ہے وہ شائد حضرت جبرئیل (قلم) کی پیدائش بتاتا ہے واللہ اعلم

[2] "قلم اُن چار چیزوں میں سے ایک ہے جن کو حق تعالیٰ نے بجائے کلمہ کن سے پیدا فرمانے کے اپنے دستہائے مبارک سے پیدا فرمایا" (روح المعانی سورہ ص) [3] ملاء اعلیٰ یعنی حق تعالیٰ کے دربار خاص (upper house) کے فرشتے حق تعالےٰ کے اسم نافع کا ظہور محکمہ تکوین و تعمیر سے ہوتا ہے۔ اس محکمہ کی دو بڑی شاخیں ہیں ایک میں خلق نفخ روح۔ علم۔ ایمان۔ نور وغیرہ کا کام حق تعالےٰ حضرت جبرئیل اور ان کے اعوان و انصار فرشتوں سے لیتے ہیں دوسری میں تغذیہ۔ تنمیہ۔ تقویہ۔ عروج اقوام صحت وغیرہ کا کام حق تعالیٰ حضرت میکائیل اور ان کے اعوان و انصار سے لیتے ہیں = اسی طرح حق تعالےٰ کے اسم ضار کا ظہور محکمہ افساد و تخریب سے ہوتا ہے یہ محکمہ تکوین و تعمیر کا مقابل و ضد ہے اس کی بھی دو بڑی شاخیں ہیں ایک میں موت۔ نزع۔ جہل۔ کفر۔ تاریکی وغیرہ کا کام حضرت عزرائیل اور ان کے اعوان و انصار سے لیا جاتا ہے اور ضعف۔ مرض۔ توڑ پھوڑ۔ زوال اقوام اور فناء عالم وغیرہ کا کام حضرت اسرافیل اور ان کے اعوان و انصار سے۔ ھذا کما اظن واللہ اعلم ۱۲

سے ارواحِ انسان[1]۔ چھٹے سے جنّت۔ ساتویں سے دوزخ۔ آٹھویں سے ارواح موالید ثلثہ (جماد۔ نبات۔ حیوان) نویں سے ارواحِ عناصر اربعہ (آب و باد و خاک و آتش) دسویں سے ملاء اسفل کے فرشتے[2] اور ارواحِ جنّ۔

مادّہ اسی مرحلہ پر پیدا ہوا اس مرحلہ سے قبل کسی چیز میں مادّہ نہ تھا اور نہ اس وقت تک زمین و آسمان، چاند، سورج، پہاڑ اور دریا بنے تھے اس مرحلہ پر آکر جنّ و انس کی تو صرف ارواح اور عناصر و موالید کی ارواح پیدا ہوئیں مگر ملاءِ اعلےٰ کے فرشتے پیدا کیئے گئے (جو روح بلا مادہ ہیں) اس پوری جماعت کو قرآن نے "ارواح" کہا پس یہی وہ مرحلہ ہے جو مدّعیانِ عقل اور پرستارانِ مادّہ کے لئے مزلّتہ الاقدام اور وبالِ جان اور خطرۂ ایمان بن گیا ہے اس لئے کہ اسی مرحلہ پر حق تعالےٰ نے ایک جوہر کو پیدا کیا جو اشیاءِ عشر کا گویا مادہ تھا اور ان اشیاءِ عشر میں موالید و عناصر کو پیدا فرمایا جو گویا زمین و آسمان کا اور ان کے متعلقات (چاند سورج پہاڑ دریا وغیرہ) کا مادّہ ہے۔ یہ مادّہ جو مخلوق تھا عقل کے بندوں اور روح کے اندھوں کی نظر میں خالق بن گیا سُبْحَانَہٗ وَتَعَالیٰ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝

۴۔ چوتھا مرحلہ اور چوتھی شان: اس مرحلہ پر حق تعالےٰ نے جن چیزوں کو

---

[1] چونکہ ان کو تمام دیگر حیوانات کے مقابلہ میں خاص امتیاز سے پیدا فرمایا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے مرتبۂ روح میں بھی ارواحِ انسانی کو ارواح موالید سے الگ پیدا فرمایا ہوگا۔ مخلوقاتِ عشر کی یہ تفصیل میں نے روضتہ الاصفیاء سے بعد ترمیم درج کی ہے ۱۲۔ [2] فلاسفہ کہتے ہیں کہ خُدا نے پہلے عقل اوّل کو پیدا کیا پھر اسی کے توسّط سے عقل دوم کو پھر اُس سے عقل سوم کو اسی طرح عقول عشرہ کو پیدا کیا۔ وہ اپنی عقل کی اُڑان اور فلسفہ کی زبان میں جن چیزوں کی تعبیر "عقول" سے کرتے ہیں شاید وہ یہی دس چیزیں ہوں اگر ایسا ہے تو فلاسفہ کی ان عقول عشرہ کا منبع و مصدر بھی وہی "جوہر اور سبز یاقوت" نکلتا ہے جس کے متعلق حضرت ابنؓ عباسؓ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی نظرِ ہیبت سے پگھل کر کئی حصّے ہوگیا واللہ اعلم۔

جاہا پیدا کیا انھیں کے ساتھ ارواح انبیا علیہم السلام کو بھی پیدا فرمایا۔ لوح محفوظ پر تقادیر خلق لکھیں اس موقع پر دو اہم واقعات پیش آئے۔

ایک یہ کہ لوح محفوظ پر انبیاؑ کی ارواح کے متعلق یہ فیصلہ تحریر فرمایا کہ آئندہ مخلوق کی ہدایات کے لئے دنیا میں پیغمبر بھیجے جایا کریں گے تمام انبیاء کو حسب ضرورت ایک مجموعہ رسالت کے مختلف ابواب وفصول دے کر بھیجا جاتا رہے گا اور سلسلۂ رسالت کے ختم پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام رسالتوں کے یکجا مجموعہ کے ساتھ سب کا خازن امین بنا کر بھیجا جائیگا اسطرح اُسی وقت جب کسی انسان کا یہاں تک کہ خود ابوالبشر حضرت آدمؑ کا پتلا بھی نہیں بنا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک کو اُس بزم رسالت کی صدارت اور کاروان انبیا علیہم السلام کی قیادت حاصل اور متعین ہوگئی اس واقعہ کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس ارشاد میں فرمایا جس کے مختلف الفاظ کتب احادیث میں مذکور و مشہور ہیں ان کا قدر مشترک یہ ہے کُنْتُ نَبِیًّا وَآدَمُ مُنْجَدِلٌ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ وَبُعِثْتُ فَاتِحًا وَخَاتِمًا" [او کما قال رواہ احمد بتغییر] یعنی میں اُسی وقت نبی بنایا جاچکا تھا جب آدم پانی اور گارے کے منازل ہی میں تھے میں ہی سلسلۂ رسالت کا شروع کرنے والا ہوں اور مجھ ہی پر یہ سلسلہ ختم ہوگا۔ ایک اہم واقعہ تو یہ ہوا۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا (اور یہ واقعہ در اصل پہلے واقعہ کی تکمیل اور اعلان کیلئے تھا) کہ حق تعالےٰ نے انبیا کی تمام ارواح طیبہ کو جمع فرما کر وہ میثاق لیا جس کا ذکر قرآن میں سورہ آل عمران کی اُس آیت میں ہے جسے ہم اس باب کے شروع میں لکھ آئے ہیں ترجمہ یہ ہے "وہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے جب اللہ تعالےٰ نے تمام انبیا علیہم السلام سے یہ میثاق لیا کہ جب میں تم کو دنیا میں بھیجنے کے بعد آسمانی کتاب سے اور حکمت و نبوت سے سرفراز کروں اسوقت اگر ایک عظیم الشان رسول تمہارے (یا تم لوگوں کی امتوں کے) پاس تشریف لائیں تو خود تم سب پر (بھی اور تمہاری امتوں پر بھی) ان پر ایمان لانا، ان کی

نصرت و مدد کرنا لازم ہوگا۔ پھر پوچھا کیا تم سب اس ذمہ داری کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد اپنے سر لیتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا جی ہاں ہم اس ذمہ داری کا کامل اقرار کرتے ہیں تو فرمایا اس عہد پر تم سب بھی آپس میں ایک دوسرے کے گواہ رہو اور میں بھی تم سب کے ساتھ گواہ بنتا ہوں لیکن یہ یاد رہے کہ تم میں سے (اور تمہاری امتوں میں سے) جس نے بھی اس میثاق سے روگردانی کی تو ایسے سب لوگ نافرمان سمجھے جائیں گے"۔

اس واقعہ سے تمام انبیاءؑ کی ارواح طیبہ نے آپ کی روح پاک کو اور آپ کے رتبہ عالی کو پہچانا۔ یہ تو عالم ارواح میں ہوا مگر عالم ناسوت اور اجسام میں بھی ایک بار جملہ انبیا کو بھی اس کا موقع دیا گیا شبِ معراج میں، مسجد اقصیٰ میں سب نے حضورؐ سے ملاقات اور آپ کی اقتدا کی ان کی امتوں کے لئے قیامت تک کا موقع ہے۔ یہ عالم ارواح بھی جتنی مدت تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا قائم و باقی رہا۔

پانچواں مرحلہ یا پانچویں شان اس کے بعد حق تعالیٰ کی تجلیاتِ جمال اور تعلیاتِ کمال نے مزید ظہور کا تقاضا کیا اور یہ تیسرا تقاضا تھا تو اللہ تعالیٰ نے عناصر اربعہ کی ارواح کیطرف توجہ فرمائی اور اُن میں سب سے پہلے پانی کو پیدا فرمایا وہ پانی ہی آج کا مادی پانی ہے چونکہ بقیہ اشیاء بلکہ خود تینوں عناصر بھی اسی پانی سے پیدا کئے گئے اس لئے فرمایا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط (انبیا) یعنی ہم نے ہر ذیحیات کو پانی ہی سے پیدا کیا غرض نہ معلوم کتنی مدت تک دنیا میں صرف ایک ہی عنصر

ك یہ پانی نیا نہیں پیدا فرمایا بلکہ یہ وہی پانی ہے جس کا ذکر پہلے مرحلہ میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عماء کی حالت میں نہ معلوم کتنے عرصے تک رہنے کے بعد پانی اور پھر عرش پیدا کیا اس کے دو حصے کئے ایک عمدہ حصہ تو عرش کے نیچے رکھ کر اس کا نام البحر المسجور رکھا اور دوسرا ادنی حصہ زمینوں کے نیچے رکھا۔ اس مرحلہ پر زمین تو بنی نہیں تھی اس لئے اس دوسرے حصے کو جہاں رکھا ہو وہاں زمین وغیرہ ہی بنانے کے لئے (یعنی اسی پانچویں مرحلہ کے لئے) محفوظ رکھا تھا۔ اسی کو اب ظاہر فرمایا وللہ الحمد اولاً و آخراً ۱۲ س

رہا اس کے بعد جب خدا کو منظور ہوا تو کچھ پانی کو ہلکا اور لطیف بنا کر ہوا[۵] کو پیدا فرمایا۔ نہ معلوم کتنی مدت تک دنیا میں صرف یہی دو عنصر پانی اور ہوا رہے۔ تورات اور منو شاستر کی مذکورہ عبارتوں میں اسی مرحلہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد جب خدا کو منظور ہوا اُسوقت آگ اس طرح پیدا ہوئی کہ ہوا عرصہ تک پانی پر متوجّ۔ ہیجان پیدا کرتی رہی لہروں کے تصادم سے رفتہ رفتہ حرارت (اور پھر بعد میں جل کر آگ) بنی ان حرارت سے دھوئیں اور ابخرے بنتے اور اُٹھتے رہے پھر جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا اُسوقت خاک اور مٹی اس طرح پیدا ہوئی کہ پانی کے نیچے گاد اور تلچھٹ بنتی اور اکٹھی ہوتی رہی (ملخص از تفسیر حقانی دوم ص۱۴۱) نجانے کب تک دنیا میں یہ چاروں عناصر اپنی سادہ ابتدائی شکلوں میں رہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا پہلے زمین کے مادّے کی طرف توجّہ فرمائی اور اسے حکم دیا "کُونی وائتی طوعاً اُدکوھا" اے زمین تو اس طرح کی بنکر پیدا ہونے اور ابھرنے کو تیار ہو جا چاہے خوشی سے بن یا ناخوشی سے تجھے اس اس انتظام کے ساتھ بننا پڑیگا۔ تو اُسنے

---

[۵] ہوا: علم مکوّنات (سائنس) کے ماہرین کہتے ہیں کہ "پانی دو ہواؤں سے مل کر بنا ہے" اُن کا مطلب یہ ہے کہ عناصر میں سب سے پہلا عنصر جو بنا وہ ہوا کا عنصر بنا جب دو ہوائیں (آکسیجن۔ ہائیڈروجن) بنیں تو دونوں کی ترکیب سے پانی بنا مگر مذہب سے حاصل شدہ اطلاعات اس کی تردید کرتی ہیں تورات کی عبارت میں ہے پانیوں کے بیچ میں ہوا بنانا چاہا منو شاستر میں ہے کہ "اول جل (پانی) کو پیدا کیا" قرآن میں ہے کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ اور جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ غرض تین مذہبوں میں یہی اطلاع ہے کہ پہلا عنصر پانی کا پیدا ہوا۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اہل سائنس کے یہاں عناصر چار سے بہت زیادہ ہیں۔ نیز ان کے نزدیک پانی کوئی مستقل جداگانہ عنصر نہیں ہے بلکہ دو عنصروں سے مرکب ہے۔ مگر اس جگہ علامہ حقانی کا یہ قول بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ مسئلہ کہ "چاروں عناصر میں سے پہلے کون سا عنصر بنا" فلاسفہ طبیین میں سخت اختلافی ہے ہر عنصر کے پہلے پیدا ہونے کے متعلق اقوال و دعاوی موجود ہیں (حقانی دوم ص۱۴۳) پس طبیین کے اقوال و نظریات "منتر سر کا آماس" تو بن سکتے ہیں مگر نہ سکون قلب کی آس بن سکتے ہیں نہ علم و تحقیق کی پیاس بجھا سکتے ہیں یہاں اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ایک حدیث مشہور ہے جس کی سند و حوالہ نہیں بیان کیا جاتا کہ "اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے اور مٹی کو پانی سے اور پانی کو ہوا سے اور ہوا کو آگ سے اور آگ کو (بقیہ اگلے صفحہ پہ

عرض کیا "اُحِبُّتُ طَائِعَۃً" حضور! جی نچاہنے کا کیا ذکر؟ میں بخوشی حسب الحکم بننے اور اُبھرنے کو حاضر ہوں چنانچہ وہ ایک خاص مدت میں جسے قرآن نے "فِی یَوْمَیْنِ" (دو دن میں) فرمایا ہے — اس طرح بنی کہ خدا نے پانی کے نیچے کی گاد اور تلچھٹ کو ٹھوس بنا کر پانی کی سطح سے اوپر ابھارا۔ آج جس جگہ کعبہ شریف بنا ہوا ہے پہلے اُسی جگہ اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پہ تھا جس کی کیفیت اللہ ہی تعالیٰ بہتر جانے بہرحال عرش کو اُسی کی سیدھ میں بہت بلندی پہ اوپر اُٹھا لیا گیا اور پانی کے نیچے سے سب سے پہلے اُسی جگہ کی زمین اُبھر کر نمودار ہوئی اسی وجہ سے اُسے کعبہ کہا گیا جس کے لغوی معنے اُبھری ہوئی چیز کے ہیں۔ غرض زمین تو ان دو دنوں میں جہاں جہاں اُسے اُبھرنے کا حکم ہوا وہاں وہاں پانی کے نیچے سے اُبھرتی، سوکھتی اور ٹھوس بنتی رہی۔ یہ ہے زمین کی پیدائش کا حال جو مذہبی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانی سے بنی۔ فارسی لغت بھی یہی بتاتی ہے کہ زم کے معنی ٹھنڈک کے ہیں زمہریر۔ زمستان اسی سے بنے ہیں اور ٹھنڈک کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ فارسی لغت نے غالباً یہ تخیل مذہب

(بقیہ سابقہ) اپنے جلال سے پیدا فرمایا" انتہٰے۔ مگر میرا ذوق اس کی صحت تسلیم کرنے سے ابا کرتا ہے اولاً اس لئے کہ میرے نزدیک تخلیق عالم جمال اور رحمت سے ہوئی نہ کہ جلال اور غضب سے ثانیاً اس لئے کہ میرے علم میں کتاب و سنت ناطق ہیں اسپر کہ پہلے پانی پیدا ہوا واللہ اعلم ۱۲ منہ اسوقت تک نہ زمین بنی تھی نہ آسمان نہ سورج ظاہر ہے کہ دن کا وجود بغیر ان کے ممکن نہیں پھر بھی جو خدا تعالےٰ نے دو دن فرمائے تو یہ مجازاً فرمایا مطلب یہ کہ اتنی مدت میں جتنے میں دو دن ہو سکتے ہوں۔ چونکہ تخلیق ارض و سما کے سلسلہ میں پہلے زمین بنی اور پہلے دو دن میں بنی اسلئے پہلے دن کو یوم الاحد (پہلا دن) اور دوسرے کو یوم الاثنین (دوسرا دن) کہا گیا تھا اسی سے یہ دونوں لفظ اتوار و دوشنبہ کے نام ہی پڑ گئے۔ مگر دو دن سے انسانی تقویم کے دو دن (۴۸ گھنٹے) نہ سمجھ لینا چاہئے بلکہ یہ دو دن خدائی تقویم کے ہیں اور خدائی تقویم میں ایک دن انسانی تقویم کے ایک ہزار برس کے برابر ہے پس زمین و آسمان کی تخلیق جو چھ دنوں میں ہوئی تو وہ ہماری تقویم کے لحاظ سے چھ ہزار برس میں ہوئی اس میں گویا اس کی تعلیم تھی کہ جب خدائے علیم نے جو قادر مطلق بھی ہے زمین و آسمان کی تخلیق چھ ہزار برس میں فرمائی تو عاجز و جاہل انسان کو اس سے سبق لیکر یہ چاہئے کہ کسی چیز کے بنانے میں جلد بازی نہ کرے بلکہ اس کے اتقان و تحسین کی زیادہ فکر کرے۔ زمین و آسمان کی تخلیق یقیناً امر "کن" سے ہوئی مگر یاد رکھنا چاہئے کہ کن کے لفظ میں سرعت و عجلت کا مفہوم نہیں ہے بلکہ مطلب یہی یہ ہے کہ تو اپنے کل لوازم کیساتھ اپنی معتاد و مقدرہ مدت میں بنکر تیار ہو۔ انسانی بچہ کی پیدائش بھی کن ہی سے ہوتی ہے مگر اسمیں بھی نو مہینے کی مدت لگتی ہے

ہی سے لیا لیکن اس کے مقابلہ میں اب سائنس کا دعویٰ ملاحظہ فرمائیے کہ "زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے۔ جو بہت پہلے سورج سے ٹوٹ کر گر پڑا پھر سینکڑوں برس میں وہ ٹھنڈا ہوا" وغیرہ وغیرہ اس سے سورج کا زمین سے پہلے بننا ثابت ہوا ہے جو مذہبی روایات کے خلاف ہے اور اس سے زمین کی اصل کا گرم ہونا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی مذہب کی معلومات کے خلاف ہے۔ مذہب تو زمین کی اصل پانی کو بتاتا ہے جو ٹھنڈا ہوتا ہے۔ زمین کو اسی حال میں چھوڑ کر حق تعالیٰ نے آسمان بنانا چاہا وہ دھوئیں اور ابخرے جو پانی اور ہوا اور حرارت سے اٹھے تھے اور ہوا پر بے ترتیب جمع تھے ان کو بھی حق تعالیٰ نے وہی حکم دیا "کُونِي وَائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا" تو وہ بھی ایک خاص مدت میں جیسے قرآن نے "فِي يَوْمَيْنِ" (دو دن میں) فرمایا اُن تمام لوازم کے ساتھ جن کا اُسے حکم ہوا تھا مکمل طور پر بن کر حاضر ہو گیا یعنی سات جُداگانہ بلند ٹھوس دَلدار تہیں[1]، ان میں حسب منصوبۂ ازلی، ملاء اعلےٰ[2] کے فرشتے۔ جن کی تعداد بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ سات ستارے[3] ــــ شمس۔ قمر۔ مریخ۔ عُطارد۔ زُہرہ۔ مشتری اور زُحل ــــ ہر ایک کا جُداگانہ محور[4]۔ تاریک رات[5]۔ روشن دن[6]۔ بے انتہا چھوٹے بڑے ثوابت[7]۔ خود فضا میں کچھ غیر مرئی کارخانے[8] ــــ جن کو خدا تعالےٰ نے السموات والارض کے ساتھ "وَمَا بَيْنَهُمَا" کے مبہم مگر شاندار لفظ میں فرمایا ہے ــــ غرض یہ کام تیسرے دن اور چوتھے (یوم الثلاثاء منگل اور یوم الاربعاء بدھ) میں ہوا۔ اس کے بعد جب زمین حسب منشا سوکھ چکی اور اپنے اندر غذائی اور معدنی ذخائر امانت رکھنے کے قابل بن گئی تو اللہ تعالےٰ نے زمین کو پھر حکم دیا کہ اب تو فلاں فلاں انتظامات کے ساتھ بن کر تیار ہو جا تو وہ ایک خاص مدت میں جس کی تعبیر قرآن نے "فِي يَوْمَيْنِ" سے اور جس کی تعیین اہل سیر نے جمعرات[9] (یوم الخمیس) اور جمعہ سے کی

---

[8] جس میں سے ایک کارخانہ عکس پذیر ہے وہ ہر انسان کے ہر قول و عمل کو ریکارڈ کی طرح محفوظ کر رہا ہے اور دوسرا عالم مثال و برزخ کا کام کر رہا ہے جو خواب میں نظر آتا ہے تیسرا کارخانہ آسمان سے بارش کی امداد لے کر خود اُسے بیتا ہے پھر زمین پر بارش کرتا ہے ۱۲-۲؎ [9] جمعرات: قرآن (حم سجدہ) میں زمین کی پیدائش کے متعلق "فی اربعۃ ایام" اور اس کے بعد "ثم استوی الی السماء" کے لفظ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حسب منشاء خداوندی بن کر تیار ہو گئی یعنی زمین کی سات جداگانہ مستقل تہیں[۱] - پہاڑ[۲] - دریا[۳] سمندر[۴] - پانی کی سوتیں[۵] - دھاتوں کی کانیں[۶] - طرح طرح کے کیڑے اور چوپائے[۷] - قسم قسم کی غذائیں[۸] - زمین کہیں بنجر کہیں زرخیز کہیں سبزہ زار و گلزار کہیں جنگل و اشجار کہیں ٹیلے کہیں غار وغیرہ -

قرآن پاک میں اس موقع کا تذکرہ اس آیۃ میں ہے "...... اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا" یعنی پہلے زمین اور آسمان دونوں گڈمڈ تھے ایک دوسرے سے ممتاز نہ تھے ہم نے ہوا کے ذریعہ ابخرے بنا کر دونوں کو الگ کیا ابخروں کو آسمان کا مادّہ بنایا اور گاد بنا کر زمین کا مادّہ بنایا اور دونوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دیا پھر ابخرے بھی باہم گڈمڈ اور ایک مجموعہ تھے ہم نے اُن سے سات الگ الگ تہیں بنا کر ایک کو دوسرے سے ممتاز کیا پھر آسمان بھی نہ پانی برسا سکتا تھا نہ روشنی پھیلا سکتا تھا ہم نے بارش آسمان سے بادلوں میں پھر بادلوں سے زمین پر برسائی اور چاند سورج ستارے بنا کر روشنی کی

(بقیہ سابقہ) لفظ سے لوگوں نے سمجھا ہے کہ وہ چاروں دن مسلسل تھے یہ لوگوں کا قیاس ہے جس کی تغلیط (والنازعات) کی آیات "ام السماء بناها ..... وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا" کر رہی ہیں پس پہلے دو دن میں زمین کا مادّہ بنا یعنی اتوار اور پیر کے دن میں پھر دو دنوں (منگل بدھ) میں آسمان بنا پھر دو دنوں (جمعرات جمعہ) میں زمین بنی - نقل سے تو یہ ترتیب ثابت ہی ہے میں کہتا ہوں کہ عقل سے بھی یہی درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ زمین جب پانی میں سے اُبھری ہو گی تو وہ پانی سے اسقدر نم اور کیچڑ اور دلدل کی طرح رہی ہو گی کہ اُس وقت اس میں پہاڑ کی سختی - غلہ اور پھلوں کے ذخیرے رکھنے کی صلاحیت کا پیدا ہونا عالم اسباب میں عادۃً ممکن نہیں ہو سکتا تھا واللہ اعلم یہاں یہ نکتہ تفسیری یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حم میں جو پہاڑ کو زمین میں جمانیکا اور غذائیں پیدا کرنے کا ذکر کر کے چار دن کا ذکر کیا اسی کی توضیح والنازعات میں فرمائی ہے کہ آسمانوں کے بعد زمین کو پھیلا کر اس میں پہاڑ جمائے غذائیں رکھیں پس حم سے چار دنوں میں زمین کی تخلیق کا راز معلوم ہوا کہ اسمیں تخلیق آسمان کے بعد والے دو دن بھی شامل ہیں - والحمد للہ

پھر زمین بھی بستگی کی حالت میں تھی تو ہم نے اس میں غلہ۔ جانوروں کا چارہ وغیرہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ کر اس کی بستگی دور کی۔

غرض جب اللہ تعالیٰ نے اتوار سے جمعہ تک چھ دنوں میں اپنی منشا و مشیت کے موافق سات آسمان۔ سات زمینیں۔ سات سیارے بنا لیئے تو ہر ایک کے متعلق الگ الگ مگر ضروری کام بھی مقرر فرما دیئے مثلاً سورج کی اور زمین کی گردشوں سے متعلق تو یہ کام کیا کہ روشن دن اور تاریک رات ظاہر ہو۔ پھر دن میں بھی صبح۔ دوپہر۔ سہ پہر۔ شام۔ رات کی ضروری اور ایک دوسرے سے ممتاز تقسیم اوقات کر دی چونکہ ان اوقات میں حق تعالیٰ کی شان ممتاز و محسوس طور پر بدل جاتی ہے اس لئے حق تعالےٰ نے عام حکم فرمایا کہ زمینی اور آسمانی تمام مخلوقات، ان اوقات میں حق تعالیٰ کی کبریائی ربوبیت۔ عظمت۔ علو۔ اور الوہیت کا استحضار کر کے اپنی اپنی زبانوں میں تسبیح۔ تکبیر تحمید اور استغفار کیا کریں۔ قرآن سورہ روم کی آیت "فسبحان اللہ حین تمسون (الی) ...... تظہرون" میں اسی کا تذکرہ ہے جسے انسانوں کے لئے شرع نے صلوٰۃ (نماز) کی اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ اس آیت میں پانچوں نمازوں کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ جملہ خبریہ ہے گویا اللہ تعالیٰ ایک واقعہ کی محض خبر دے رہے ہیں مگر دراصل اس خبر سے حکم اور انشا مراد ہے کہ اے انسانو چونکہ ان اوقات میں ہر جگہ زمین اور آسمانوں میں تمام مخلوقات خدا کی حمد و تسبیح کر رہی ہے اس لئے تم بھی ان وقتوں میں خدا کی تسبیح و تحمید کیا کرو یعنی نماز پڑھا کرو کیونکہ نماز تسبیح و تحمید و تکبیر کو مشتمل ہے۔

[نکتہ] ان اوقات میں دراصل حق تعالےٰ کی ایک خاص تجلی ہوا کرتی ہے جس کا نام تجلی ساق ہے ساری کائنات ان اوقات میں وہی تجلی دیکھتی ہے اس لئے خاص تسبیح و تحمید کرتی ہے اور اضطرار کرتی ہے مسلمانوں کو بھی اسی کا حکم دیا گیا ہے۔

فقہا نے اس پر کافی بحث کی ہے کہ فرضیتِ صلوٰۃ کی علت اور موجب کیا ہے؟ کسی نے کہا دخول وقت ہے کسی نے کہا ورود امر ہے۔ مگر ملا علی قاری کی ایک روایت دیکھکر شبہہ ہوتا ہے کہ شاید فرضیت کی علت اسی تجلی ساق کا دیدار و مشاہدہ ہے اور پھر ارکان صلوٰۃ بھی اختیاری نہیں کچھ اضطراری افعال ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نے صبح صادق کیوقت بے اختیارانہ دو رکعت نفل پڑھیں جو بعد والوں پہ نماز فجر کے نام سے فرض ہوئیں حضرت اسحٰقؑ نے دوپہر کے وقت شکرانہ میں بے اختیارانہ چار رکعات نفل پڑھیں وہی نماز ظہر بنکر فرض ہوئی پھر حضرت عزیرؑ نے سہ پہر کو شکرانہ میں بے اختیارانہ نفل پڑھی جو بعد میں نماز عصر بن کر فرض ہوئی۔ پھر حضرت داؤدؑ نے سورج ڈوبتے چار رکعات بے اختیارانہ مقام شکر واستغفار میں پڑھنی چاہیں مگر تین رکعات کے بعد شدت گریہ سے بیتاب ہوکر نماز ختم کردی چار رکعات پوری نہ کر سکے۔ یہ نماز مغرب بن کر بعد والوں پر فرض ہوئی اور نماز عشا حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے پہل پڑھی (مرقات شرح مشکوٰۃ باب مواقیت الصلوٰۃ ملخصاً)

ظاہر ہے کہ ان حضرات پہ نہ شرع ظاہر کا امر و حکم نماز کے لئے دیا گیا تھا اور نہ تعین وقت کسی ضابطہ کے ماتحت تھا بلکہ اُن کے باطن نے کچھ اُدھر کا بھی اشارہ پاکر یعنی یہی تجلی دیکھ کر بے اختیارانہ نماز میں تسبیح و حمد کی۔

یہی تجلی ہے جو مسلمانوں کے اور اُن کے رب کے درمیان تعارف کا ذریعہ ہے اور اسی تجلی کا مشاہدہ ان کے اور انکے رب کے درمیان ایک علامت بنتی جارہی ہے۔ اسی علامت اور اسی تعارف کے ذریعہ یہ لوگ جب قیامت میں پہلے حق تعالےٰ کو کسی دوسری صورت میں دیکھیں گے تو باوجودیکہ حق تعالیٰ ان کو حکم دیں گے کہ مجھے سجدہ کرو یہ لوگ انکار کردیں گے اور کہیں گے کہ معاذ اللہ کہ آپ ہمارے رب ہوں۔ ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان تو ایک علامت ہے۔ ہم ان کو پہچانتے ہیں اس پہ حق تعالیٰ کی تجلی ساق ظاہر ہوگی اسے

دیکھتے ہی یہ لوگ سر بسجود ہو جائیں گے کہ ہاں یہی صورت ہے جو ہماری جانی پہچانی ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

زنجیرِ درِ عرش ہلاتا ہوں میں — اللہ و غنی کیسے بلاتا ہوں میں
سجدہ کے بہانے ہو کے بیتاب امجد — قدموں میں کسی کے لوٹ جاتا ہوں میں [امجد حیدرآبادی]

یہ تو ایک نکتہ تھا اب اس تشریح کے بعد ترتیب یوں سمجھ میں آتی ہے۔

۱۔ فرائض کی فرضیت مطلقہ کی علت تو امر الٰہی ہے جس کا ذکر اقیموا الصلوٰۃ میں ہے۔

۲۔ فرائض متعینہ کی علت دخول وقت ہے کیونکہ فرائض منسوب ہیں انھیں اوقات کیطرف

۳۔ لیکن حقیقت صلوٰۃ کا ظہور اور وجود مستفاد ہے ظہور تجلی ساق سے۔ اس قول سے تمام اقوال میں معتدل اور قابل اعتماد تطبیق ہو گئی واللہ اعلم اس قدرتی تقسیم سے مدد اور اشارہ پا کر انسان نے بھی پہر گھنٹے۔ منٹ۔ سکنڈ۔ پہر۔ پل۔ گھڑی وغیرہ کی تقسیمیں تیار کیں یہ کام تو سورج سے متعلق کیا اسی طرح چاند کی اور زمین کی گردشوں سے ہمیں ممتاز تاریخیں اور ان سے ایک مہینہ پھر بارہ مہینوں کا ایک دورہ (سال) خود مقرر فرمایا (حقانی چہارم ق ۲۱۶) محرم سے ابتدا کر کے ذی الحجہ پر انتہا فرمائی بعض کو بعض پر فضیلت بخشی اور چار مہینوں (محرم۔ رجب۔ ذلیقعد۔ ذی الحجہ) میں خاص حرمتیں رکھ دیں۔ اسی طرح ساتوں سیاروں کی اور زمین کی گردشوں سے سات دن بھی خود ہی مقرر فرمائے۔ ان میں بھی جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں پر فضیلت دی۔ یہ تینوں تقسیمیں اور تینوں انتظامات خدا تعالےٰ کے مقرر کردہ ہیں ان انتظامات میں انسانی عقل کو ذرا بھی دخل نہیں۔ اسی لئے میرے نزدیک ان تینوں ہی انتظامات میں تغیر اور انسانی مداخلت کو "زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ" کہہ کر منع فرمایا علمائے ربانیین بھی ہمیشہ قمری مہینوں کی تاریخیں اپنی تحریرات میں استعمال کرتے ہیں کیونکہ وہی ممتاز یقینی اور خدائی تقسیم اوقات ہے شمسی تاریخیں تو انسانی جدت ہیں۔

چونکہ حق تعالےٰ نے جمعہ کی دوپہر تک زمین اور آسمان کی تخلیق کا کام پورا فرمایا اور

اس کی مشیت کو اسی دن میں آئندہ بھی بہت سے اہم کام کرنے تھے مثلاً تخلیق آدم پیغمبر آخر الزماں کا تشکم مادر میں استقرار۔ وفات آدم۔ اقامت قیامت وغیرہ اس لئے اگلی آسمانی دینوں میں اس دن کا احترام مقرر فرمایا تھا مگر بجز امت محمدیہ کے کسی اور کو اس روز مبارک کی برکتیں اور سعادتیں نہ مل سکیں۔ یہود نے تو یہ دیکھ کر کہ خدا تعالے نے سنیچر کے دن تخلیق کائنات کا کوئی کام نہیں کیا اور اس کا نام سبت رکھا۔ قصد و شرارت سے یا اشتباہ اور غلطی سے یہ سمجھا کہ "چھ دن کام کر چکنے کے بعد نعوذ باللہ اللہ تعالے تھک گئے تھے اس لئے سنیچر کو آرام فرمایا اور اس کا نام سبت رکھا جس کے معنے آرام کے ہیں" اپنے دل سے جمعہ کا احترام ختم کر کے سنیچر ہی کی تعظیم کرنا شروع کر دیا اور جمعہ کی برکات سے محروم ہوئے اور بھٹک گئے یہود نے اتنا نہ سوچا کہ معاذ اللہ وہاں تھکن کا کیا کام اور آرام کا کیا ذکر؟ حق تعالیٰ یہود کی اسی گستاخی کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں "ہمنے زمین، آسمان کو اور ان دونوں کے درمیان (اپنی عجائبات قدرت) کی چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں تھکن چھو بھی نہیں گئی" (قرآن - قٓ) رہے نصاریٰ تو انھوں نے بھی جمعہ کے احترام کے حکم کو سرسری سمجھا اور اپنے خیال میں اتوار کو اس لئے جمعہ سے زیادہ احترام کے قابل سمجھا کہ اتوار سے خدا نے تخلیق کا کام شروع فرمایا اس طرح انھوں نے بھی جمعہ کی برکات کھو دیں۔ ہنود تیسرے سے کسی دن کے احترام کے قائل ہی نہیں۔

۶۔ چھٹا مرحلہ یا چھٹی شان

بہرحال جب زمین کا فرش۔ پہاڑوں کے میر فرش آسمان کی چھت، سورج کی مشعل۔ چاند کا چراغ۔ ستاروں کے قمقمے۔ درختوں کی چھتریاں۔ سمندروں کے حوض۔ دریاؤں کی نالیاں۔ ہوا کا پنکھا۔ ابر کا سقا۔ پھلوں کی غذا۔ پھولوں کا گلدستہ۔ کان کا خزانہ۔ جانوروں کا عجائب خانہ پوری رونق کے ساتھ بن کر تیار ہو گیا تو حق تعالےٰ کو منظور ہوا کہ اب اہل نظر آئیں اور اس نمائش گاہ کا افتتاح کیا جائے۔ حق تعالےٰ کی تجلیات جمال کا ظہور و نمود

لے یاد نہیں کہ کس کتاب میں دیکھا تھا کہ آفرینش عالم کے وقت بھی صور پھونکا گیا تھا سچ ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کیلئے یہ چوتھا تقاضا تھا۔

اہلِ سیر بالعموم لکھتے ہیں کہ "جب زمین و آسمان کی تخلیق جمعہ کی دوپہر تک تمام ہوئی تو اللہ تعالےٰ نے اسُی دن بعد عصر سیدنا آدم علیہ السلام کا پُتلا بنایا اور اس میں رُوح پھونکی چونکہ حق تعالےٰ نے اسُی دن میں زمین و آسمان کے ساتھ تخلیق آدم کو بھی جمع فرمادیا تھا اسلئے اس دن کا نام جمعہ رکھا" اسکے معنی یہ ہوئے کہ وہ حضرات انسان کو زمین و آسمان کا ہم عمر سمجھتے ہیں مگر میرے نزدیک تو انسان (حضرت آدم علیہ السلام) کی پیدائش زمین و آسمان کی پیدائش کے بہت بعد ہوئی ہے اور انسان عمر میں ارض و سما سے بہت چھوٹا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے قبل نہیں معلوم کون کون سی مخلوق اور کتنی مخلوق زمین پر رہ چکی ہے اور یہی مخلوق نہ معلوم کتنی کتنی مدت تک رہی ہے۔ قرآن پاک کی آیت "وَالْجَانَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ" سے اتنا تو صاف اشارہ ملتا ہے کہ خاک کی مخلوق (انسان) کی پیدائش سے قبل آگ کی مخلوق (جن) اس زمین پر بستی تھی۔ یہ وہی ترتیب ہے جو آپ پانچویں مرحلہ میں خود عناصر کی پیدائش کی ترتیب میں پڑھ آئے ہیں کہ سب سے آخر میں خاک کا عنصر بنا اور اس سے قبل آگ کا عنصر بن چکا تھا۔ یہاں پہونچ کر ایک خیال میرے دل میں گزرا جسے میں اس اعتراف اور اعلان کے ساتھ یہاں درج کرتا ہوں کہ یہ میرا قیاس ہے یہ اکابر سے حاصل شدہ علم نہیں کہ میں سند و حوالہ دے سکوں وہ یہ کہ پھر کیا عجب ہے کہ زمین پر انسان سے قبل جو جو مخلوق گزری ہوں وہ منحصر ہوں بقیہ تین عناصر میں یعنی وہ مخلوقات صرف آگ۔ ہوا۔ پانی ہی کی مخلوقات رہی ہوں پھر جو ترتیب خود عناصر کی تخلیق میں ملحوظ رہی ہے کہ پہلے پانی بنا پھر ہوا پھر آگ پھر خاک۔ اسُی ترتیب سے ان عناصر کی مخلوقات بھی بنی ہوں یعنی آخر میں خاک کی مخلوق انسان بنا اس سے قبل آگ کی مخلوق

(بقیہ سابقہ) اول بآخر نسبتے دارد جب عالم کے اختتام پر پہلا صور پھُنکے گا تو یقیناً عالم کے افتتاح پر بھی پھونکا جانا مناسب تھا، پھر نفخۂ ثانیہ کی حکمت بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ عالم آخرت کا افتتاح ہو رہا ہے اسلئے صور پھونکا جارہا ہے ۱۲ منہ

جن بنا اس سے قبل ہوا کی کوئی مخلوق رہی ہو اور اس سے بھی قبل پانی کی کوئی مخلوق رہی ہو۔ خاک اور آگ کی مخلوقات (انس و جن) کا تو قطعی طور پر حال قرآن پاک سے معلوم ہو چکا۔ ہوا کی مخلوق کے متعلق میرا قیاس ہے کہ وہ وہ ہوائی فرشتے ہیں جو جنوں سے قبل اس دنیا میں اس آسمان کے نیچے رہتے تھے اور نہ معلوم کتنے عرصہ تک یہ فضا صرف انھیں سے آباد رہی۔ اس قیاس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مولانا عبدالحق حقانی نے لکھا ہے:۔

"جن وہ مخلوقِ الٰہی ہے جس کا مادہ آگ یا ہوا ہو..... (پھر چار سطر بعد) ...... کیونکہ ملائکہ ارضیہ اور جن اعلےٰ قسم ایک ہی چیز ہیں پس اسی لحاظ سے کبھی اسکو جن اور کبھی فرشتے کہا (مقدمہ تفسیر ص ۱۹) نیز ابن عباسؓ کا یہ قول ملاکہ "إِنَّ مِنَ الْمَلَائِكَةِ جِنْسًا يَتَوَالَدُونَ هُمُ الْجِنُّ" یعنی فرشتوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جنکی نسل چلتی ہے ان کو جن کہتے ہیں۔ ان اقوال سے یہ سمجھ میں آیا کہ بعضے جن آگ کے کثیف مادہ سے بنے ہیں ان کی جنس میں مادہ کی غلاظت و کثافت کے باعث توالد و تناسل ہوتا ہے ان کو تو جن ہی کہتے ہیں لیکن بعض فرشتے ہوا سے پیدا ہوتی ہے اُن میں توالد و تناسل نہیں ہوتا ان کو فرشتہ بھی کہتے ہیں اور جن اعلےٰ بھی یہ فرشتے ملاءِ اسفل کے فرشتے ہوتے ہیں اس خیال کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ قرآن پاک کے مختلف کلمات "وَالذّٰرِيٰتِ والمرسلات والعاصفات۔ حاملات۔ جاریات۔ مقسمات کی تفسیر ہواؤں سے بھی کی گئی ہے اور فرشتوں سے بھی۔ پس میرا خیال ہے کہ جنوں سے بھی قبل اس آسمان کے نیچے زمین پر یا جو ہوا میں ہوائی مخلوق یعنی زمینی فرشتے رہتے تھے جن کی نسل نہیں تھی۔ اب رہی پانی کی مخلوق جو ہوا کی مخلوق سے بھی پہلے پیدا ہوئی ہو تو جمع الفوائد باب بدء الخلق کی یہ روایت دیکھ کر کہ "قاموس البحر میں ایک فرشتہ مقرر ہے جس کے سر اٹھانے سے سمندر میں مد و جزر آتا ہے" یا روضۃ الاصفیا کی یہ ضعیف تر روایت دیکھ کر کہ زمین ایک مچھلی کی پشت

پر قائم ہے "۔ ضعیف سا گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ فرشتہ اور یہ پچھلی پانی سے بنی ہوئی مخلوق ہی ہوں وَاللہُ اَعْلَمُ۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس طرح خاک اخیر میں پیدا ہوئی اسی طرح اس کی بنی ہوئی مخلوق میں سے آدم زمین و آسمان کے بننے کے بھی بہت بعد پیدا ہوئے اور دیگر عناصر آگ۔ ہوا۔ پانی کی مخلوقات کے بھی بہت بعد میں پیدا ہوئے اس لئے یہ صحیح نہیں کہ جس جمعہ کو حق تعالیٰ زمین کی آخری اصلاح و تخلیق سے فارغ ہوئے اسی جمعہ کو آدمؑ بھی پیدا ہوئے۔ آدمؑ جمعہ ہی کے دن پیدا ہوئے سہی مگر اسی جمعہ کو نہیں جس میں حق تعالیٰ نے ارض و سما کی تخلیق سے فارغ ہوئے۔

چونکہ فرشتہ۔ انس و جن کی قسموں کا ایک ذکر ابھی گزر چکا ہے اس لئے حسب ذیل نکتہ غالباً ازدیاد بصیرت کا سبب ہوگا۔

روح ایک لطیف جوہر ہے۔ مادّہ اور رکمیت سے تعلق رکھنے کے اعتبار سے روح کی قسمیں اس طرح پر ہیں :-

۱۔ اگر اس میں مادّہ اور رکمیّت دونوں نہیں ہیں تو وہ ملائکہ فلک۔ ملاءِ اعلےٰ ہیں ان میں توالد و تناسل نہیں۔ ان کے لئے نورانی جسم غیر محسوس و غیر مرئی تجویز کیا گیا۔ وہ روح ہی روح ہیں اسی جماعت کو قرآن میں " الرّوح " فرمایا گیا۔

۲۔ اگر اس میں مادہ اور رکمیّت دونوں کا تعلق ہے تو اگر مٹی اور پانی کا مادّہ غالب ہے تو وہ انسان اور حیوانات ہیں۔ انہیں مادّہ کے باعث توالد و تناسل ہے اور انکو محسوس جسم دیا گیا۔

۳۔ اگر اس میں مادّہ اور رکمیت کے تعلق کے ساتھ آگ اور ہوا کا مادہ و عنصر غالب ہے تو یہ جن ہیں یعنی ہوا کا غلبہ والے جن قسم اعلےٰ یا ملاءِ اسفل کے فرشتے کہلاتے ہیں ان میں بھی توالد و تناسل نہیں ان کو قران میں " الملائکہ " فرمایا اور اگر آگ کا

مادہ غالب ہے تو جن قسم ادنیٰ زامثل عفریت، شیطان۔ مارد ہیں ان میں تناسل ہوتا ہے انکو
”جن“ فرمایا۔

۴۔ اگر اُس میں مادہ نہو صرف کیفیت ہو تو یہ جسم مثالی ہے اسمیں بھی توالد و تناسل نہیں اسکا جسم خیالی ہیئت کی طرح ہوتا ہے اس کا نام روح سریانی اور روح تمیز بھی ہے، یہی ہے جو خواب دیکھتی ہے اسی پر عذاب قبر ہوگا۔ یہ جسم مثالی انسان کے مادی جسم کے اندر پورے کا پورا اترا اور سمویا ہوا ہے۔

بہر حال قرآن پاک میں ہے ”وَالْجَانَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ“ یعنی ہم نے آدم سے پہلے جان[۱] کو لوؤں کی آگ (گرم ہوا) سے پیدا کیا تھا۔ اس آیت سے

---

[۱] جس طرح انسانوں کے سرِ سلسلہ، مورث اعلیٰ اور ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام تھے اسی طرح جنوں کے سرِ سلسلہ مورث اعلیٰ اور ابوالجن کا نام جانّ تھا۔ جس طرح آدم کو بلا ماں باپ کے مٹی سے پیدا کیا اسی طرح جان کو بلا ماں باپ کے گرم ہوا سے پیدا کیا اور ان دونوں سے قبل ملاء اعلیٰ کے تمام فرشتوں کو بلکہ ہر سرِ سلسلہ کو محض اپنی قدرت و حکمت سے عام اور معروف طریق ولادت کے برخلاف پیدا کیا ہے اس لئے حق تعالٰی کے بارہ میں یہ سوال ”کہ جب آدم کے ماں باپ نہیں تھے تو ان کی پیدائش کیونکر ہوئی“ محض جہالت ہے اور یہ سوال کہ ”بغیر مرغی کے انڈا اور بغیر درخت کے بیج کیونکر ہو سکتا ہے“ محض نادانی ہے ایمان کی بات یہ ہے کہ ”وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ“ اللہ تعالیٰ ہر طریق کی تخلیق پر پورے قادر ہیں دیکھئے جانّ۔ آدم۔ ملائکہ آسمان کو بلا نر و مادہ کے توسط کے پیدا کیا۔ حضرت حوا کو صرف نر سے پیدا کیا۔ حضرت عیسٰیؑ کو صرف مادہ سے پیدا کیا اور تمام مخلوق کو برابر نر و مادہ کے تعلق سے پیدا فرمایا ہے پس اس کے سامنے یہ سوال کہ ”پہلے انڈا تھا یا مرغی“ اس لئے لغو ہے کہ مذکورہ مثالوں میں خدا نے بعض چیزیں ایسی بھی بنائی ہیں کہ اُن پر ”انڈے سے مرغی کی تشبیہ صادق آتی ہے اور بعض ایسی چیزیں بھی بنائی ہیں کہ ان کو ”مرغی سے انڈے“ کی تشبیہ دے سکتے ہیں۔ بہر حال جب جان (ابوالجن) پیدا کئے گئے تو قیاس چاہتا ہے کہ ان کی بیوی کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے کسی طریقہ پر پیدا کیا ہوگا پھر آئندہ نسل نر و مادہ کے تعلق سے چلی ہوگی۔ یہیں اپنا ایک اور قیاس بھی عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ جس طرح خاکی انسانوں کو حکم ہے کہ مرنے کے بعد اس کو مٹی میں چھپا دیا جاوے اور اس کو اس کی اصل سے بلا دینا چاہئے اسی طرح غالباً ناری جنوں کے لئے مرنے کے بعد ان کی لاشوں کو آگ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ آدمؑ (انسان) سے پہلے دنیا میں جانؔ اور ان کی ذرّیت کو پیدا کیا وہاں اس امر کا بھی انکشاف ہوا کہ جانؔ (جنوں کے سر سلسلہ) کی پیدائش معروف طریقہ نر و مادہ کی وساطت سے نہیں ہوئی۔ بہر حال جن زمین میں رہتے بستے تھے ہیں اُن کی نسل چلی۔ جنوں میں اچھے بھی تھے اور بُرے بھی۔ اللہ تعالےٰ غلط کار جنوں کی ہدایت کے لئے انھیں میں سے اچھے جنوں کو وقتاً فوقتاً پیغمبر بنا کر بھیجتے رہتے تھے تاکہ ان کی اصلاح ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک پیغمبر کا نام یوسف بھی تھا سرکش جنوں (عفریتوں) نے انھیں قتل کر ڈالا۔

ساتواں مرحلہ یا ساتویں شان

جب جنوں کی سرکشی اور نافرمانی بہت بڑھ گئی تو حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ عالم عنصری

(لقیہ سابقہ) میں جلانے کا حکم رہا ہو گا تاکہ ان کو ان کی اصل میں ملا دیا جا سکے انکے لئے مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ کی سبیل آگ سے جلانا ہی تھا۔ واللہ اعلم۔

ایک کتاب "برہم اُتر کھنڈ" نظر سے گزری اس میں حسب ذیل باتیں پڑھ کر تعجب ہوا چاہتا ہوں کہ ناظرین کو بھی اس تعجب میں شریک کروں:- لکھا ہے ۱۔ "برنبھا (شاید برہما؟) اور مہا دیو ست جگ میں تھے دونوں بن ماں باپ کے پیدا کیے گئے خدا نے برنبھا کو نور اور آگ سے اور مہا دیو کو آگ اور ہوا سے پیدا کیا ص۲۸ - ۲۔ جنوں کے باپ سونا یا سومان نستت تھے ان کا لقب جان تھا انھیں کو مہا دیو کہتے ہیں ص۲۳ ۳۔ جنوں کے نبی اور رسول بسنسٹ جی تھے جو خود بھی جن تھے انھوں نے مہا دیو سے فیض پایا تھا ص۱۸

۴۔ مہا دیو نے اپنی قوم جن کو تریتا کے ختم پہ آگاہ کر دیا تھا کہ غرور میں آکر فساد نہ مچا ؤ ورنہ خدا ایک شخص کو پیدا کرے گا جو زمین میں تمہارا نام نہ رہنے دے گا ص۲۶ ۔ ۵۔ رامچندر اور کرشن - ارجن آدم کی اولاد میں نہ تھے یہ لوگ تریتا میں تھے ص۲۷ ۔ ۶۔ آدم دوا پر کے آخر میں پیدا کئے گئے ص۲۸ ۔ ۷۔ کرشن کا ظہور اس لئے ہوا کہ تمام جنوں اور عنصری دیوتاؤں کو قتل کر کے کنس دیت کو ماریں اور ملک ہند کو ان سے خالی کرائیں تاکہ آدم اور ان کی اولاد اس پہ قبضہ کرے ص۲۸

واللہ اعلم بحقیقۃ الحال =

میں ایک شاہکار کی تخلیق فرمائیں اس کے لئے تین احکام نامے (سرکلر) جاری فرمائے ایک کا ذکر اہلِ سیر (قدیم تاریخ والوں) نے اور اربابِ تفاسیر نے کیا ہے اور بقیہ دو کا ذکر خود قرآن پاک میں ہے:

پہلا حکمنامہ فرشتوں کے نام یہ جاری ہوا کہ تم زمین پر جاؤ اور تمام (یا شاید صرف مُفسد اور سرکش) جنوں کو قتل کرو اس لئے کہ انھوں نے زمین میں بہت اُدھم مچا رکھی ہے اور زمین (کا میدانی حصہ) ان سے خالی کراؤ۔" چنانچہ اس کی تعمیل میں فرشتوں نے جنوں کو قتل کرنا شروع کیا ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جنوں کو قتل کر رہے تھے اتفاقاً انھوں نے ایک نوجوان جن کو جس کا نام حارث یا عزازیل تھا دیکھا کہ بڑا صاحبِ علم اور بڑا عبادت گزار ہے فرشتے اس کی عبادت دیکھ کر اُس کے قتل سے رُکے اور حق تعالےٰ سے اُس کے متعلق سوال کیا اور شاید اس کی عبادت دیکھ کر اس کی کچھ سفارش بھی حق تعالیٰ کی جناب میں کی حق تعالےٰ نے فرمایا" اچھا فی الحال اُسے اپنے ساتھ آسمان پر لاکر رکھو"۔ چنانچہ وہ اُسے اپنے ساتھ آسمان پر لے گئے۔ وہ وہاں فرشتوں کے ساتھ رہتا آزادی سے ہر طرف گھومتا جو غذا فرشتے کھاتے وہی خود بھی کھاتا اور فرشتوں کی عبادتیں دیکھ دیکھ کر اُن کی نقل کرتا اور نئی نئی عبادتیں سیکھتا [بیان القرآن۔ اعراف۔ بتغیر یسیر۔ در منثور۔ کہف ابن کثیر بقرۃ]

دوسرا حکمنامہ فرشتوں کے نام یہ جاری ہوا کہ" اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" یعنی اب میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ نائب۔ وائسرائے بنا کر بھیجنا چاہتا ہوں"۔ شاید یہ حکمنامہ پہلے تھا اور جنوں کے قتل کے حکم اور زمین کے میدانی حصہ کے خالی کرانیکا حکم اسی کیلئے تھا کہ چونکہ" میں اب اپنا ایک خلیفہ زمین میں بھیجنا چاہتا ہوں اس لئے جنوں سے زمین خالی کرانا چاہتا ہوں پس انھیں قتل کرو") یہ سرکلر سُن کر کچھ مقرب فرشتوں نے باادب عرض کیا کہ" آپ کیا زمین میں پھر کسی ایسی مخلوق کو پیدا فرمائیں گے جو

فساد[1] مچاتا اور خون بہاتا پھرے؟ اگر یہ خلافت کا کام ہم بندگان دربار کر سکتے ہوں تو ہم تسبیح خواں لوگ ہی اس خدمت کے لئے بھی حاضر ہیں" حق تعالےٰ نے فرمایا "میں اسکا حال تم سے[2] زیادہ جانتا ہوں"۔

اس کے بعد تیسرا حکمنامہ اور اطلاع نامہ فرشتوں کے نام یہ نکلا کہ "اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ ۝ یعنی سنو! میں عنقریب گیلی مٹی سے ایک بشر (مرئی و محسوس جسم والا مخلوق) بنانے والا ہوں تو جب میں اُسے بنا چکوں اور اسمیں اپنے پاس کی خاص روح پھونک چکوں (اور تم کو سجدہ کا حکم بھی دوں تو دیکھنا حکم کی خلاف ورزی نہ کرنا بلکہ) فوراً سب اس کے آگے سلامی و تعظیم کو جھک جانا"۔

[ضروری توضیحات] ۱۔ ابلیس و عزازیل کو عام طور پر مُعلّم الملکوت (تمام فرشتوں کا استاد) کہا جاتا ہے عام تفاسیر میں تو اس کے متعلق اتنا ہی ہے کہ کَانَ مِنْ اَشَدِّ الْمَلٰئِکَۃِ اِجْتِہَادًا وَّاَکْثَرِہِمْ عِلْمًا (ابن کثیر اول ص [illegible]) یعنی وہ فرشتوں میں سب سے زیادہ مرتاض اور سب سے بڑھ کر صاحب علم تھا ممکن ہے کسی روایت میں "کَانَ یُعَلِّمُ الْمَلٰئِکَۃَ" کی قسم کے الفاظ بھی آئے ہوں مگر میرے نزدیک اُسے معلّم (استاد) کہنا صحیح نہیں میرے نزدیک یا تو یہ لفظ کسی نے دراصل متعلّم الملٰئکہ (فرشتوں کا شاگرد) کہا ہوگا۔ کم علموں نے بے احتیاطی اور بے التفاتی سے اُسے معلّم (استاد) پڑھ اور سمجھ لیا اور پھر وہی غلطی

---

[1] فرشتوں نے پہلے تو عزازیل کی عبادت دیکھ کر اُس کے ساتھ حسن ظن کیا پھر جنوں کی سرکشی دیکھ کر یا خاک کی ظلمت دیکھ کر آئندہ خلیفہ کی سیرت کو اس پر قیاس کیا اور خلیفہ کو خاکی الاصل دیکھ کر اُسے مفسد و سفاک جانا تو اُن کے یہ دونوں قیاسات غلط نکلے جیسا آئندہ حالات نے ثابت کر دیا۔ فرشتے غیب نہیں جانتے تھے ۱۲۔

[2] یعنی تم اگر میرے خلفائے قدوسیت ہو اور نوریان فلک کے لئے میرے رسول اور خلیفہ اور مدار تکوین ہو تو وہ نئی مخلوق میرا خلیفۂ احکام اور خاکیان زمین کے لئے میرا رسول و خلیفہ اور مدار ارشاد ہوگا۔

چل پڑی اور ابتک چلی جا رہی ہے، اگر یہ صورت ہے تو قابلِ اصلاح ہے اور یا پھر ملائکہ سے صرف ملاءِ اسفل (زمینی فرشتے) مراد ہوں اور ابلیس زمینی فرشتوں کا استاد یا انہیں سب سے زیادہ مرتاض و عالم رہا ہو ورنہ ابلیس کو ملاءِ اعلےٰ (آسمانی فرشتوں) کا بھی جن میں حضرت جبرئیل علیہ السلام وغیرہ داخل ہیں) استاد ماننا کیونکر درست ہو گا؟ ان کی صفت تو معصومیت و اطاعت ہے اور ابلیس کی معصیت و اباء و استکبار بھلا کہاں ملائکہ فلک اور کہاں ابلیس! دوسرے یہ کہ استاد کی صحبت و طبیعت و تربیت کا اثر اور عکس شاگرد میں آنا لازمی ہے۔ اگر اسے ان کا استاد مانا جائے تو پھر تو اس قسم کے چور دروازے بہت سے کھل جائیں گے کہ جبرئیل قرآن لائے تھے علیؓ پر مگر قصداً یا خطاءً محمدؐ پر نازل کر گئے" نعوذ باللہ!

۲۔ تیسرے حکمنامہ میں میں نے اوپر فقعوا لہٗ ساجدین کے ترجمہ سے قبل اتنی عبارت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے کہ " اور میں تم کو سجدہ کا حکم بھی دوں تو دیکھنا اس کی خلاف ورزی نہ کرنا بلکہ فوراً سجدہ میں گر پڑنا" یہ اضافہ اس لئے کیا گیا کہ مجھے اس مقام پر مفسرین کرام سے اختلاف ہے۔ توضیح یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کا ذکر قرآن میں گو سات مقامات (بقرہ۔ اعراف۔ حجر۔ بنی اسرائیل۔ کہف۔ طٰہٰ۔ ص) پر ہے مگر ان تمام ہی مقامات پر فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم نہیں ہے۔ دو مقامات (حجر اور ص) میں صرف ذکرِ سجدہ ہے بقیہ پانچ مقامات (بقرہ۔ اعراف۔ بنی اسرائیل۔ کہف۔ طٰہٰ) میں حکم سجدہ ہے۔ حکم سجدہ اور چیز ہے اور ذکرِ سجدہ اور چیز ہے۔ ذکر سجدہ تو ضمناً اور حکایۃً عن الماضی و المستقبل بھی ہو سکتا ہے۔ حکم سجدہ کے بعد تو ملائکہ کی تعمیل و امتثال کا اور ابلیس کے اباء و انکار و اخراج کا ذکر موزوں اور درست ہو سکتا ہے مگر ضمنی یا حکائی ذکر کے ساتھ امتثال ملائکہ یا استکبار ابلیس کا ذکر موزوں اور درست نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ مفسرین کرام کو یہاں دو اشتباہ پیش آئے اور ان اشتباہات کا صحیح حل ان کے ذہنوں کی گرفت میں نہیں آسکا اس لئے انھوں نے ساتوں مقامات

پر حکم سجدہ سمجھا اور ہر جگہ وہ امتثال ملائکہ یا استکبار ابلیس و اخراج کے کل واقعات تفصیلاً یا اجمالاً توضیحاً یا تلمیحاً لکھ گئے۔ ایک اشتباہ تو یہ کہ اتفاق سے حجر اور ص میں بھی لفظ فقعوا لہٗ ساجدین میں امر کا صیغہ قعوا، اسجدوا کا مرادف تھا تو وہ سمجھے ہونگے کہ یہاں بھی حکم سجدہ مفہوم ہوتا ہے۔ مگر اس اشتباہ کا جواب یہ ہے کہ قعوا پر فا داخل ہے جو تعقیب کا فائدہ دیتا ہے۔ فا صاف بتاتا ہے کہ یہ ضمنی خبر ہے ان اطلاعات اولیہ کی کہ میں عنقریب ایک بشر بنانے والا ہوں اور تم کو اس کے بنانے کے بعد اس کے سامنے سجدہ کا حکم دینے والا ہوں پس جب میں اسے بنا چکوں اور اسمیں اپنی طرف سے ایک شریف روح (روح انسانی) پھونک چکوں تب تم اسکے سامنے جھک جانا۔ پس قعوا کا امر کوئی مستقل حکم نہیں ہے بلکہ اذا سویتہ کی شرط کا جواب اور انی خالق وغیرہ امور مستقبلہ کی حکایت ہے اور بس دوسرا شبہہ یہ کہ اتفاق سے حجر اور ص میں بھی قعوا کے بعد فسجد الملائکۃ الخ آگیا ہے اس سے شبہہ ہوا ہوگا کہ جب ان مواقع پر بھی واقعات امتثال ملائکہ و استکبار و اخراج ابلیس کا ذکر قرآن میں ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی حکم سجدہ ہے۔ شبہہ یقیناً قوی ہے اور یہی ان علما کیلئے عذر کافی ہے مگر چونکہ یہاں ایک تناقض ہے اسلئے یہاں تاویل و توجیہہ کرنی پڑے گی تناقض یہ کہ انی خالق کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ پیشگی اطلاع ہے اور فقعوا صرف جواب ہے اذا سویتہ کا۔ یہ دو قرآن تو بتا رہے ہیں کہ یہاں مستقبل کی حکایت مقصود ہے مگر فسجد کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ یہ واقعہ ہوا بھی ہے تو دونوں میں تناقض ہوا پس تاویل یہ کی جائیگی کہ قرآن پاک کے متعدد مواقع کیطرح یہ آیات بھی کسی واقعہ کی جزئیات کا مسلسل بیان نہیں کرتیں بلکہ اس میں فقعوا ایک مستقبل کے واقعہ کی حکایت ہے۔ جو بہت پہلے دی گئی اس کے بعد کے چند وقائع اور ان کا ذکر (مثلاً یہ کہ پھر خدا نے آدمؑ کو پیدا بھی فرمایا پھر تعلیم اسما دی پھر سب کو حکم سجدہ دیا) سب محذوف ہیں اسکے بعد فسجد الملائکۃ بہت بعد کے ایک واقعہ کے وقوع کا ذکر اخباری ہے۔ میرے نزدیک حجر اور ص کی پیشگی اطلاع اس حکمت سے ہے کہ ابلیس کے عصیان کی شناعت زیادہ واضح

ہو جائے کہ ایک مہتم بالشان حکم کی پیشگی اطلاع کے بعد بھی اس نے نافرمانی کی جرأت کی!
نیز میرے نزدیک پیدائش آدمؑ کے وقت فرشتوں سے سجدہ کرایا ہی نہیں گیا کیونکہ محض پیدائش نہ آدمؑ کے لئے وجہ تعظیم بن سکتی تھی نہ ان کو مستحق مسجودیت بنا سکتی تھی پس پیدائش کے ساتھ ہی حکم سجدہ معقول نہیں ہو سکتا۔ حکم سجدہ تو تعلیم اسماء کے اور امتحان میں کامیابی کے بعد ہی زیادہ موزوں ہو سکتا تھا کہ جب تمام جن و ملک نے آدم کی فضیلتِ علمی کا تجربہ و مشاہدہ کر لیا تب ضروری ہوا کہ اس تعظیم کے عملی اعتراف میں انکے سامنے سجدہ بھی کریں۔ اس کے علاوہ ایک اشکال اور بھی ہے وہ یہ کہ اگر حجر اور ص میں بھی حکم سجدہ مانا جائے تو لازم آئیگا کہ آدم کو سجدہ دو بار ہوا ہو جیسا حقانی وغیرہ نے بقرہ و حجر میں لکھا ہے۔ خیر یہاں تک تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن دو دو بار انکار ابلیس دو دو بار اسکا اخراج۔ اور دو دو بار اس کی دعائے عمر طویل کے ماننے میں نہ بات بنتی ہے نہ دل میں اترتی ہے۔ (۳) ظاہری چمک دمک کے باعث نار اور نور تو ہمیشہ سب کو محبوب اور سب کے نزدیک مقبول و معزز ہے مگر خاک کا حسن و جمال اور فضل و کمال بالعموم سب سے مخفی رہا کچھ تو اس تذلل و مسکینی کی وجہ سے کہ زمین پیروں تلے بچھی پڑی رہتی ہے۔ کچھ ظلمانی ہونے کے باعث اور کچھ اس وجہ سے کہ دیگر عناصر کی مخلوق عمر میں اس کی مخلوق سے بڑی تھی [اور عمر میں جو بڑے ہوتے ہیں وہ اپنے سے چھوٹوں کو نہ بہتر مان سکتے ہیں نہ اُن کے فضل کا اعتراف کر سکتے ہیں] نیز کچھ اس وجہ سے کہ خاک کے بعض حریفوں (نار و نور) نے اپنی تعریف میں خود قصیدے بھی پڑھے یعنی نور نے اس کے مقابلے کے لئے کہا تھا نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ پھر خاک کی مخلوق پر یوں تعریض کی تھی کہ اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ اپنے کو تسبیح خواں اور خاکی کو فسادی و خونخوار کہا تھا نار نے بھی اس کے مقابلہ کے لئے اپنی تعریف میں "اَنَا خَيْرٌ" اور خاکی پر تعریض کے لئے خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ کہا غرض ان وجود سے خاک اس وقت سے لے کر آجتک

عموماً اخس العناصر سمجھی جاتی رہی ہے حالانکہ خاک ہی افضل العناصر تھی یہی وجہ تھی کہ وہ بقیہ عناصر کے بعد پیدا ہوئی اور افضل ہمیشہ دوسروں سے بعد ہی میں منصۂ شہود پر آتا ہے۔
پھر شاباش ہے اس خاک کی وُسعتِ ظرف کو اور حلم کو کہ نہ اُس نے حریفوں کی دیکھا دیکھی اپنی تعریف کا قصیدہ پڑھا نہ دوسروں کی تعریض کا کوئی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور آفریں ہے اسکے عشق و فہم کو کہ اُس نے اپنی ذلت و مسکینی کو اپنے رب کا ایک عطیہ سمجھا اور اپنی رسوائی پر قناعت کی تو پھر بحکم مَن تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ اللہ تعالےٰ نے بھی طرح طرح سے اُسی مسکین خاک اور نہ اُسی فسادی خاکی کو فضائل و کمالات اور ترقی درجات دی پھر تمام مخلوقات پر یہاں تک کہ خود ناریوں اور نوریوں پر بھی اس کے بلند درجے عیاں فرمائے اس کے حریف تینوں عناصر میں نہ ٹھہراؤ تھا نہ جماؤ۔ ان میں سے کسی میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ اگر اُن کے پاس کوئی "امانت" رکھی جائے تو وہ اس امانت کا حق ادا کر سکیں اور اُسے اپنے پاس سالم اور محفوظ رکھ سکیں۔ ہوا اُسے بکھیر دیتی، پانی اُسے بہا دیتا آگ اسے جلا کر راکھ کر دیتی۔ متانت و صلابت۔ ایثار و قناعت حلم و سکنت۔ تذلّل و استکانت۔ اطاعت و امانت کے اوصاف عالیہ بجز خاک کے کسی دوسرے عنصر میں نہ تھے۔ اس کی انھیں صلاحیتِ ذاتیہ کی بنا پر خالقِ عناصر جلّ جلالہٗ نے یہ حکیمانہ فیصلے فرمائے تھے کہ اپنی کائنات میں جب اپنا خلیفہ بناؤں گا تو عنصر خاک ہی کی مخلوق کو بناؤں گا یعنی جس طرح خاک افضل العناصر تھی اسی طرح اسکی ایک مخلوق کو بھی اشرف المخلوقات بناؤں گا پھر جس طرح خاک بقیہ عناصر کے بعد پیدا ہوئی اُسی طرح اُسکی مخلوق کو بھی میں دیگر عناصر کی مخلوقات کے بعد پیدا کروں گا اور اُس کی انواع میں سے اشرف نوع (انسان) کو اس کی دیگر انواع (حیوانات) کے بعد میں پیدا کروں گا اور اُس اشرف انواع میں سے اشرف افراد کو ان کے (انبیا) سلسلہ کے تمام افراد کے بعد اسطرح پیدا کرونگا کہ ان کے اندر اپنی اصل (خاک) کی صفات حلم و سکنت متانت و امانت اسدرجہ کامل ہو گی کہ انکا لقب ہی "امین" ہو گا صلی اللہ وعلے اخوانہ الانبیاء و صحابہ وازواجہ و ذریاتہ وبارک وسلم۔

باب دوم

سوانح آدم علیہ السلام از تخلیق تا وفات

۱۔ گزشتہ مراحل کے بعد حق تعالیٰ کی تجلّیاتِ جمال و تعلّیاتِ کمال نے مزید نمود و ظہور کا تقاضا کیا یہ پانچواں تقاضا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عزرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم جا کر زمین کے حصّوں سے ہر قسم کی تھوڑی تھوڑی سی مٹّی لاؤ چنانچہ وہ سُرخ۔ سپید۔ کالی بھوری ہر قسم کی مٹّی لے کر آئے حق تعالےٰ نے اپنے دونوں مبارک ہاتھوں سے اُسے پانی سے گوندھا اور گوندھ کر اُسے چھوڑ دیا جب اُس میں بدبو آنے لگی تو اسے دھوپ اور ہوا میں اتنا سکھایا کہ وہ ٹھیکرے کی طرح کھن کھن بجنے لگی تب حق تعالےٰ نے جنّت میں یا (بقول اکثر) مکہ و طائف کے درمیان کے ایک مقام نعمان نام میں اس گندھی سوکھی مٹّی سے حضرت آدم علیہ السلام کا پُتلا بنایا یہ پُتلا دوسرے جانوروں کے جسموں اور سانچوں سے الگ ایک جداگانہ سانچہ اور خاص نمونہ کا تھا اور ساٹھ ہاتھ لانبا تھا اور اس پُتلے کو اپنی صورت کا یعنی اپنے کمالات کا عکس دیدیا۔ اپنی صفات کا مظہر اور نمونہ بنایا اور اسے خیر و شر کا مجمع البحرین۔ جلال و جمال کا سنگم اور معرفتِ نفس و معرفتِ حق دونوں کا ذوق شناس بنایا آدم کا پُتلا مکمل کرنے کے بعد جو کچھ مٹّی بچ رہی تھی اُس سے

۱؎ قرآن میں ہے خلقت بیدی۔ اسکا مفہوم بیان کرنے میں تین مسلک ہیں بہتر مسلک یہ ہے کہ ید کا ترجمہ ہی نہ کیا جائے بلکہ یوں ہی کہا جائے کہ اللہ نے اپنے دونوں ید سے پیدا کیا۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ اسکا ترجمہ ہاتھ نہ کیا جائے بلکہ قدرت کیا جائے تیسرا مسلک یہ ہے کہ اسکا ترجمہ ہاتھ تو کر دیا جائے مگر یہ بھی کہا جائے کہ جو مراد اللہ کی اس سے ہو اسے اللہ ہی جانے ہمارا اس پر ایمان ہے۔ یہ تینوں مسلک درست ہیں۔ میں نے تیسرے مسلک کے لحاظ سے ترجمہ کیا ہے۔ ۱۲

کھجور کا درخت پیدا فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے حدیث میں انسان سے مشابہ درخت فرمایا گیا بلکہ ایک روایت کے الفاظ تو یہ ہیں کہ "اَکْرِمُوْا عَمَّتَکُمُ النَّخْلَةَ فَاِنَّهَا مِنْ بَقِيَّةِ طِيْنَةِ آدَمَ" (جامع صغیر) یعنی اپنی پھوپھی یعنی کھجور کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھو کیونکہ آدم سے بچی ہوئی مٹی سے وہ بنائی گئی ہے۔ بہرحال آدم کا پتلا بنا کر روح پھونکنے سے قبل اسے کچھ عرصہ تک چھوڑے رکھا ابلیس اُسے دیکھ دیکھ کر بہت گھبراتا تھا اس نے پتلے کو چاروں طرف سے گھوم پھر کر خوب غور سے دیکھا پھر بدن کے اندر گھس کر بھی دیکھا اس کے بعد فرشتوں سے کہا کہ "میں نے اسے خوب جانچ پرکھ کر دیکھ لیا ہے یہ تو اندر سے کھوکھلا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے گا اگر یہ کبھی میرے پالے پڑ جائیگا تو میں خوب خوب اسے پچھاڑوں گا تم لوگ بھی اس سے ڈرنا نہیں" (ابن کثیر) ابلیس سن چکا تھا کہ حق تعالیٰ زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والے ہیں تو وہ پہلے سمجھتا تھا کہ کوئی ملاءِ اعلیٰ کا فرشتہ مقرب خلیفہ بنایا جائے گا مگر جب ان کو یہ کہہ کر کہ "میں مادہ سے بنے ہوئے کو خلیفہ بناؤں گا۔ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے" چپ کر دیا تو اُسے اُمید ہونے لگی کہ شاید یہ عہدہ مجھے ملے۔ وہ اپنے علم و عبادت پر نازاں تھا۔ مگر جب یہ پتلا بنتا دیکھا تو اُسے یقین ہونے لگا کہ خلیفۂ خداوندی غالباً یہی خاکی پتلا بننے والا ہے اُسی وقت سے اس کے دل میں آدم کی طرف سے حسد کی آگ بھڑکنے لگی لیکن اُسوقت کسی نہ کسی طرح وہ اُسے چھپائے رہا کہ ناگاہ حق تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کے بہت بعد آج سے کچھ اوپر سات ہزار برس پہلے ماہ محرم میں جمعہ کے دن بعد عصر حضرت ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کے پتلے میں خاص شرف والی روح پھونکی حوریان جنت نے نغمے گائے نوریان فلک نے ایک دوسرے کو مبارکبادیاں دیں خوب کہا ہے حکیم مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ؎

حسن شورید کہ صاحب نظرے پیدا شد
نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد (علیہ السلام)

جن جس جگہ پُتلے میں رُوح پہونچتی جاتی تھی سوکھی مٹی، سُرخ گوشت اور کھال میں تبدیل ہوتی جاتی تھی اور بے حس پُتلے میں حرکت ہونے لگتی تھی۔ ناک میں روح پہونچی تو ان کو چھینک آئی آپ نے الہام خداوندی سے اَلحَمدُ لِلّٰہِ کہا۔ اس پر خود حق تعالےٰ نے جواب میں یَرحَمُکَ اللہ فرمایا۔ آنکھوں میں روح پہونچی تو آپ نے آنکھیں کھولیں سامنے جنّت کے درخت اور پھل نظر آئے آپ اُن کو دیکھنے لگے۔ کمر تک روح پہونچی تھی کہ ہستی کے بیدار ہونے کے ثبوت میں آپ سے لیٹا نہ گیا اُٹھ بیٹھے۔ ٹانگوں میں روح دوڑی تو آپ نے بھی اُٹھ کر دوڑنا چاہا مگر کھڑے نہ ہو سکے گر پڑے اس پر "کان الانسان عجولاً (انسان بڑا جلد باز ہے)" کا عتابِ محبت اور خطابِ ناز سننا گوارا کیا مگر بے حسی اور بے عملی گوارا نہ ہوئی۔ جب پیر انگلیوں، ایڑیوں اور تلوؤں میں بھی روح پہونچ لی تو اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا وہ دیکھو فرشتوں کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی ہے اُن سے جاکر ملو اور پہلے خود السلام علیکم کہو اس کے جواب میں وہ لوگ جو کچھ کہیں اُسے غور سے سننا اور یاد رکھنا۔ یہی کلمات تمہاری نسل میں باہم ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو دُعا کیلئے جاری ہوں گے۔ آپ گئے اور ان کو السلام علیکم کہا انھوں نے جواب میں وعلیکم السلام کہا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک جنت میں مقیم رہے جس کی مقدار تقویم خداوندی میں نماز عصر سے مغرب تک اور انسانی تقویم میں سو سال ہے۔

۲۔ اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ حضرت آدم کو خلافت عطا فرمائیں۔ اس سلسلہ میں ضروری تھا کہ ایک تو اس احتمال کی گنجائش نہ رہے کہ بعد میں کبھی کوئی مخلوق یہ کہے کہ یہ کام تو ہم بھی کر سکتے تھے دوسرے خلیفہ جو مقرر ہو اس کو خلافت کے لئے ضروری تعلیم اور تربیت (ٹریننگ) بھی دیجائے۔ تیسرے ساری کائنات کے سامنے اُسے خلافت عطا کیجائے چوتھے یہ کہ خلیفہ کو عطائے خلافت کے بعد سب سے اسکی تعظیم کرائی جائے

سب سے اسے سلامی دلائی جائے پانچویں یہ کہ خود اُس خلیفہ سے بھی شاہنشاہ کائنات رب العالمین جلّ جلالہٗ کی وفاداری کا حلف لیا جائے چنانچہ ان امور کا انتظام حق تعالےٰ نے یوں فرمایا کہ "عرضِ امانت" کے ذریعہ امیدواران خلافت کی عرضیاں طلب کیں اس کے بعد "تعلیمِ اسماء" کے ذریعہ خلیفہ کی ٹریننگ کی ضرورت کو پورا کیا گیا اسکے بعد "اَنۡبِئۡهُمۡ" کے موقع امتحان پہ ساری کائنات کے سامنے خلیفہ کو کامیابی کی ڈگری اور سند عطا ہوئی اس کے بعد حکم "اسجدوا" سے عطائے خلافت کا اعلان کیا گیا اور ساری کائنات سے خلیفہ کو سلامی دلوائی گئی اس کے بعد "میثاقِ الست" کے ذریعہ خود خلیفہ سے حکومت حق کے سامنے حلفِ وفاداری اٹھوایا گیا۔ پس میرے نزدیک عرض امانت۔ تعلیم اسما۔ امتحان انبئهم۔ حکم اسجدو اور میثاق الست یہ سب دراصل عطاء خلافت ہی کے سلسلہ کی کڑیاں ہیں جو عطاء خلافت کی عقلی ضرورتہائے مذکورہ کو ترتیب وار پورا کرتی ہیں اور ہر مرحلہ پہ اتمام حجت کی شان رکھتی ہیں چنانچہ پہلے عرض امانت کا مرحلہ اس صورت سے طے فرمایا کہ حق تعالےٰ نے ملائکہ۔ جن۔ آدم۔ تین ذوی العقول اور زمین۔ پہاڑ۔ آسمان تین غیر ذوی العقول مگر گرانڈیل مخلوقات میں سے ہر ایک کو فہم کلام کی قوت۔ غور و فکر کی عقل۔ ادائے جواب کی قدرت عطا فرما کر ان سے یوں خطاب کیا: "میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانا چاہتا ہوں اسلئے کہ اگر میں بذاتِ خود سب کے سامنے موجود رہوں گا اور مخلوقات سے اپنے احکام پہ عمل کراؤں گا تو میرے سامنے تو کائنات کی ایک چیز بھی موجود اور باقی نہیں رہ سکتی اس لئے میں نے خود پس پردہ رہنے کا اور تنفیذِ احکام کے لئے خلیفہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے میں پس پردہ رہ کر دیکھتا ہوں گا کہ کون اچھے عمل کرتا اور ہم کو کتنا یاد رکھتا ہے۔ خلیفہ کا کام یہ ہوگا کہ ساری کائنات پہ میری نیابت میں حکومت کرے سب سے میرے احکام کے مطابق کام لے تمام معاملات و مقدمات

اور تمام تعلقات وتصرفات میں عدل وانصاف سے کام کرے سب کے متعلق اپنے فرائض بھی پہچانے اور سب کے حقوق بھی ادا کرے ایسی حکومت میری ایک امانت [1] ہے تم میں جو مخلوق اس امانت کو اُٹھانے کی ہمت کرے اور یہ ذمہ داری لینا چاہے وہ اپنے آپ کو پیش کرے ۔ تو ہم خلافت سے متعلق ضروری صلاحیتیں مثل عقل وفہم ، علم وتجربہ ۔ کائنات سے حلف وفاداری اور دیگر سہولتیں اس کو عطا فرمائیں گے ۔ پھر اگر وہ اس میں کامیاب ثابت ہوگا تو ہم اُسے سب سے زیادہ انعام اور جزا دیں گے اور اگر ناکام رہا تو الزام اور سزا دیں گے"۔

حق تعالیٰ کے اس اعلان کو سُن کر چھ امیدواروں [2] میں سے تین امیدوار آسمان پہاڑ ۔ زمین تو اسی وقت ڈر گئے اور گھبرا گئے انھوں نے سوچا کہ ہم اپنے اس موٹاپے کو اپنے گراں ڈیل ڈول کو بلکہ یقیناً کارِ خلافت کو انجام نہ دے سکیں گے ۔ مان لیا کہ سرکار کے دربار سے ہم کو سہولتیں اور کامیابی پر بہت سا انعام بھی ملے گا مگر امیدِ نان پہ بیمِ جان میں پڑنا کیا ضرور ؟ اس لئے انھوں نے تو فوراً متفق اللفظ صاف عرض کر دیا :

"حضور ! ہم سے تو یہ ذمہ داری کا کام نہ ہو سکے گا"۔

جن وملک نے بھی یا تو جواب ہی نہیں دیا یا شائد کچھ مبہم جواب دیا یا شائد ابھی جواب

---

[1] مسند امام اعظم میں امانت کی تفسیر امرت اور حکومت ، حدیث سے ثابت ہے ۱۲ ص ۵۲ عام طور سے عرض امانت کا مخاطب صرف تین ہی مخلوقات زمین آسمان پہاڑ کو سمجھا جاتا ہے مگر اس بحث کو لکھنے کے وقت میرے ذہن میں یہ اُلجھن پیدا ہوئی کہ ان غیر ذوی العقول سے تو حق تعالیٰ نے "امانت" (یعنی عدل کے ساتھ حکومت) کے قبول کرنے نہ کرنے کے متعلق دریافت کیا اور ذوی العقول ملائکہ جن ۔ انس سے نہ دریافت کیا حالانکہ امانت کے قبول کرنے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی توقع ان ذوی العقول ہی سے زیادہ کیجا سکتی تھی ؟ تو میرے ذوق نے نہیں نہیں بلکہ حق تعالیٰ کے کسی فضلِ خاص نے ــــ مجھے یہی سمجھایا کہ "عرض امانت چھ امیدواروں کے سامنے ہوا ہوگا"۔ چنانچہ میں یہی لکھ گیا لکھنے کے بعد اچانک لفظ حملہا الانسان سے یہ اشارہ سمجھ میں آیا کہ ضرور انسان سے بھی پوچھا گیا تھا ورنہ آخر آدم وہاں پہونچے کیونکر جو اپنے کو پیش کیا ؟ پھر جی میں آیا کہ ذرا تفاسیر تو دیکھ لو دیکھا ابن کثیر ۳ ص ۵۲۲ میں جن کا ذکر اور خازن ج ۳ ص [illegible] میں ملائکہ کا ذکر بھی عرض امانت کے سلسلہ میں مل گیا اس توافق اور تائید پر دیر تک حق تعالیٰ کی حمد کرتا رہا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا وللہ الحمد ۱۲

دینے بھی نہیں پائے تھے کہ وہ جو جسم میں ان سب سے پست قوّت میں سب سے سست، عمر میں سب سے چھوٹے اور تجربہ میں سب سے کم تھے انھوں نے اپنی فہم خداداد سے ایک طرف تو یہ محسوس کیا کہ اس وقت حق تعالیٰ کا کچھ منشا ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مخلوق اس امانت کو اُٹھانے کی ہمت کر ہی لے دوسری طرف اپنی فطرت سے مجبور ہو گئے کہ نہ انکار کر سکے نہ چپ رہ سکے اگر عقل سے کام لیتے تو یہ بھی وہی کچھ کرتے جو اُن پانچوں نے اپنے طرزِ عمل سے ظاہر کیا جو طاقت میں ان سے زیادہ اور قامت میں ان سے بہت زیادہ تھے مگر ان کے بے چین دل نے ان کو عقل کی راہ پر پڑنے ہی نہیں دیا بلکہ عشق کی راہ دکھائی اور بقول اقبال رح

ے بے دھڑک کود پڑا آتشِ نمرود میں "عشق" عقل تھی محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ذلّت اور مسکنت اُن کی خمیر۔ اُنس اور آن ان کا ضمیر۔ جنون عشق[1] ان کا امیر تھا اُن سے نہ رہا گیا صف سے آگے بڑھے اور کہا۔

"ے" چو بعدِ خاک شدن یا زیاں بُوَد یا سود بہ نقد خاک شوم بنگرم چہ خواہد بود (رومی)

لائیے حضور! یہ امانت میں اپنے سر لوں گا جب اس کے لئے ضروری سامان اور ضروری سہولتیں بھی سرکار سے ملنے والی ہیں تو پھر میری خمیر اور میرا ضمیر اجازت نہیں دیتا کہ میں مآل اور مستقبل کو اور صرف اس تاریک پہلو کو دیکھتا اور سوچتا رہ جاؤں کہ "خدانخواستہ اگر اس ذمہ داری میں کچھ تقصیر ہو گئی تو..... اگر امانت کی خدمت پوری نہ ہو سکی تو....." اگر آپ کا منشا یہ ہے کہ یہ امانت اُٹھائی جائے تو ضرور اٹھائی جائے گی اور سرکار کا منشا پورا ہو کر

---

[1] حملھا الانسان کا ایک محمل میرے نزدیک یہ ہے کہ جیسے میں نے ایک شعر میں کہا ہے ے ڈر گئے ارض و سما بارِ امانت سے مگر۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا حکم کا رسوا ہونا: اس صورت میں اس کا ربط "انہ کان ظلوماً جھولا" سے بھی یوں بن جائیگا کہ اس کے معنے یہ کہے جائیں کہ "انسان نے اپنے ضُعف کے باوجود جو یہ بار اٹھالیا تو اس نے اپنے ضُعف پر بڑا جبر و ظلم کیا اور وہ اس بار کی اہمیت سے ناواقف بے خبر اور جاہل تھا واللہ اعلم۔

رہیگا۔ اگر یہ بہتر اور بہتر لوگ نہ اُٹھا سکیں تو نہ سہی یہ کہتر اُٹھانے کو حاضر ہے اداۓ امانت اگر مجھ سے عمدہ طور پر بالفرض نہ بھی ہو سکے گی تو نہ سہی جتنی کچھ بھی ہو سکتی ہے میں اتنی کروں گا اور ضرور کروں گا کوتاہیوں کی معافی کی توقع سرکار سے رکھتا ہوں لیکن حکم سننے کے بعد اگر مگر اور ہیچر میچر کرنا عقلمندوں کا کام ہے اور ہم دیوانگانِ عشق کے پاس بھلا عقل وخرد کا کیا کام؟ حق تعالےٰ اس دلیرانہ اقدام سے بہت خوش ہوئے اور سب پر واضح ہو گیا کہ خلافت آدم ہی کو ملے گی۔

۳۔ اب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ عطاءِ خلافت کے سلسلہ کی دوسری ضرورت "خلیفہ کی تعلیم وتربیت" پوری کی جائے تو حق تعالےٰ نے ان کو "اسماء" کی تعلیم دو جداگانہ نصابوں میں دی۔ ایک نصاب تو علم عام کا تھا چنانچہ اس سلسلہ میں حق تعالےٰ نے حضرت آدمؑ کو تمام ملائکہ اور جن کے سامنے حروفِ ہجا۔ مختلف علوم۔ مختلف زبانیں تمام اشیاء کی صورت۔ ان کے نام۔ ان کے خواص اور کام وغیرہ تعلیم فرمائے حتیٰ کہ چمچہ۔ پیالہ تک کا نام اور کام تعلیم فرمایا۔ حضرت آدمؑ کو خدا نے حافظہ بھی غیر معمولی دیا تھا اور فہم وعقل بھی۔ ایک ہی دفعہ کی تقریر میں سب کچھ سمجھتے اور ذہن نشین کرتے گئے[۱] جب نصاب اول کی تعلیم ختم ہوئی تو حق تعالیٰ نے امتحان کا مرحلہ پیش فرمایا اس میں جہاں آدمؑ کے فضل وشرف کا اظہار مقصود تھا وہاں ملائکہ وجنّہ کے بعض خطرات کا جواب دینا اور اتمام حجت کرنا بھی منظور تھا۔ ملائکہ کے نفوس میں بجا طور پر یہ حدیث النفس گزر رہی تھی کہ "لَن يَّخلُقَ رَبُّنَا خَلقًا اَكرَمَ عَلَيهِ مِنَّا وَلَا اَعلَمَ۔ لِسَبقِنَالَهُ وَرُؤيَتِنَا مَا لَم يَرَهُ" (جلالین) یعنی چونکہ ہم فرشتگان دوسری مخلوقات سے پہلے پیدا ہوئے ہیں اور ہم حق تعالےٰ کی قدرت کی ایسی ایسی چیزیں دیکھ چکے

۲ قصص اسلام حصہ اول

---

۱ جب آدم کے اس دورہ اخیر کے چند فرزند مثلاً امام بخاری۔ امام ترمذی۔ امام نسائی وغیرہ کے حافظے بھی ایسے تھے کہ ان کے واقعات سنکر حیرت ہوتی ہے تو حضرت آدم کی قوتِ حافظہ پر کیوں تعجب ہو؟

اور دیکھ رہے ہیں جسے دوسری مخلوق دیکھ نہیں سکتی اس لئے ہمارا خیال ہے کہ ہمارا پروردگار کسی مخلوق کو ہم سے زیادہ علم اور عزت والا ہرگز نہ پیدا فرمائیگا۔" یہ تو ملائکہ کا حال تھا اور حارث عزازیل عرف ابلیس اُدھر اپنے علم و عبادت پہ نازاں تھا۔ ناری ہونے کی وجہ سے ظلم وعلو اس کا خمیر اور اَنَا خَیرٌ اس کا ضمیر بن چکا تھا پھر شاید عرضِ امانت کے مرحلہ پہ انکا جواب بھی تشفی بخش نہ تھا اس لئے حق تعالے نے ملائکہ اور جنّہ[1] دونوں سے فرمایا کہ" آدم کو جو تعلیم دی گئی وہ تم سب کے سامنے دی گئی ہے اُسے تم سب بھی تو سُن رہے تھے۔ اچھا تو ذرا تعلیم اسما کا یہ نصاب۔ جو آدم کو پڑھایا گیا ہے۔ ذرا میرے سامنے ایکبار دُہراؤ تو سہی۔" فرشتوں اور جنوں نے اپنے اپنے ذہنوں پہ جو غور کیا تو محسوس ہوا کہ بالکل کورے ہیں نہ کچھ سمجھے نہ یاد رکھ سکے تو فرشتوں اور عام جنوں نے تو صاف صاف اس مرحلہ پہ عرض کر دیا اور گویا منصبِ خلافت سے استعفا و دست برداری دیدی اور اپنی نا اہلی کا اظہار و اقرار کر لیا اور کہا" واقعی آپ کے فیصلے ہر قسم کے عیب سے اور الزام کے احتمال سے بالکل پاک ہیں ہم یہ نصاب نہ سمجھ سکے اور نہ دُہرا سکتے ہیں۔ ہمیں تو بس اتنا ہی علم ہے جتنا آپ نے ہم کو ہماری عرضِ آفرینش کے پیشِ نظر سکھا دیا ہے" الغرض جب ملائکہ اور جنّہ کا عجز ظاہر ہو گیا تو حق تعالےٰ نے حضرت آدمؑ سے فرمایا:

" اچھا ذرا تم تو یہ تعلیمات ان سب کے سامنے دُہرا جاؤ" حضرت آدمؑ نے فوراً اشیا کی اشکال اور صورت سے لیکر اُن کے نام اور کام تک کی ساری تقریر جو استادِ ازل جل جلالہٗ سے سنی تھی سب من و عن دُہرا دی۔ یہاں ایک نکتہ سمجھ میں آتا ہے جی نہیں مانتا کہ اُسے حق تعالیٰ کا دیا ہوا ایک خاص علم نہ سمجھوں اور اسے اہلِ علم کی خدمت میں استصواباً نہ پیش کروں کسی امتحانِ خاص کے موقع پہ شفیق اور رفیق استاد اپنے کسی خاص

---

[1] میں نے انبئونی کی ضمیر فاعلی سے ملائکہ اور جنّہ دونوں کو اس قیاس پہ مراد لیا ہے کہ لفظ قرآنی قلنا للملائکۃ اسجدوا میں بھی مفسرین کرام نے ملائکہ اور جنّہ دونوں کو مراد لیا ہے ۱۲ واللہ اعلم

عزیز طالب علم کے متعلق دل سے یہ چاہتا ہے کہ یہی شاگرد سب سے اچھے جوابات دے یہی سب سے اوّل آئے دوسرے شاگرد اس کے برابر صحیح اور عمدہ جوابات نہ دے سکیں اور اکثر استاد کی یہ کیفیت نفسی، یہ تعلق خاطر اتنی قوی اور اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ خارج میں اس شاگرد کے ذہن پر ہمت باطنی اور توجہ باطنی بن کر واقعۃً اثر انداز بھی ہو جاتی اور شاگرد کے لئے مایۂ امداد بھی بن جاتی ہے یہ تو عاجز انسانوں تک کا حال ہے۔ مجھے حضرت آدمؑ کے امتحان کے معاملہ میں بھی کچھ اسی قسم کی القاء باطنی اور مدد باطنی کا رنگ معلوم ہوتا ہے دو وجہوں سے ایک تو اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کا ملائکہ وغیرہ سے "انبئونی باسماء ھؤلاء" فرمانے سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تعلیم اسماء کی تقریر یہ ملائکہ وغیرہ کے سامنے ہی کی تب ہی تو فرما رہے ہیں کہ یہ تقریر مجھے سناؤ (جو ابھی تم نے مجھ سے سنی ہے) تو جب تعلیم اسماء علانیہ ہوئی پھر مفسرین کرام یہ کیوں کہے جا رہے ہیں کہ "حق تعالیٰ نے آدم کے قلب میں اسما کے صُوَر و خواص القا فرمائے"۔ میرے نزدیک بات دراصل توجہ باطنی اور ہمت باطنی ہی کی ہے جس کا ذکر میں کر رہا ہوں مگر یہ معاملہ امتحان کے وقت ہوا نہ کہ تعلیم کے وقت۔ اس ہمت باطنی کی نظیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اسراء کا واقعہ ہے کہ لوگوں نے امتحان لینا چاہا کہ بتائیے بیت المقدس کے کتنے دروازے ہیں اور کتنی کھڑکیاں ہیں اور کس کس سمت میں ہیں ؟ تو حق تعالیٰ نے بیت المقدس کو حضورؐ کی نگاہوں کے سامنے لا کھڑا کیا اور آپ نے سب کچھ دیکھ دیکھ کر بتا دیا پس یہ قلب آدم پر القا کا مضمون تو صحیح ہے مگر موقع و محل وہ نہیں ہے جو مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ جب حق تعالیٰ ملائکہ وغیرہ سے امتحان دینے کو فرماتے ہیں تب تو اَنْبِئُوْنِیْ فرماتے ہیں مگر جب آدمؑ کا امتحان لینا چاہتے ہیں تو اَنْبِئْنِیْ نہیں فرماتے اَنْبِئْھُمْ فرماتے ہیں آخر اس تغیر عنوان کی کوئی وجہ ؟ کیا صرف تفنن ؟ میرے نزدیک اس میں ایک راز ہے ملائکہ سے یہ

فرمانا کہ تم سب مجھے سناؤ میرے سامنے دہراؤ اور آدم سے یہ فرمانا کہ تم ان ملائکہ وغیرہ کو سناؤ اور ان کے سامنے دہرا جاؤ اللہ اکبر! کتنا فرق ہے ان لفظوں کے وزن و اثر میں! بھلا کس کی مجال ہے کہ اگر خود حق تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہو تو حق تعالیٰ کے امتحان میں پورا اتر سکے یا ان کے سامنے لب کشائی کر سکے؟ میرا تو خیال ہے کہ انہونی سن ہی کر ملائکہ و جنہ گھبرا گئے ہوں گے اور جو دو ایک بات وہ محفوظ کر بھی سکے ہونگے اور بتا بھی سکتے ہوں گے وہ بھی حق تعالیٰ کی ہیبت و عظمت کے سامنے بھول گئے ہونگے لیکن آدم سے یہ فرمایا کہ تم ان کو سناؤ گویا آدم کے ضعف پہ رحم اور فروتنی کی قدر فرما کر ان کے قلب پر اپنی ہیبت و عظمت کا اثر پڑنے ہی نہیں دیا۔ واللہ اعلم ولہ الحمد اولاً و آخراً

۴۔ اس کے بعد حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ آدمؑ کو نصاب خاص کی بھی تعلیم دیں تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک حکم ملائکہ و جنہ دونوں کو تو مشترک طور پہ دیا اور دو احکام آدمؑ کو دیئے کیونکہ وہ خلیفہ ہونے والے تھے۔ ملائکہ و جنہ کو تو یہ حکم دیا کہ

"تم سب کے سب میرے اس خلیفہ کی تعظیم کرو اور ان کے سامنے سجدہ کرو۔"

یعنی میری وفاداری کا حلف اٹھانے کے لئے سب اس کے سامنے جھک کر اسے سلامی دو۔ فرشتے تو یہ سنتے ہی سر بسجود ہو گئے انھوں نے سلامی دے کر حلف وفاداری فوراً اٹھالیا مگر ابلیس نے جو یہ حکم سنا تو اس کے دل و دماغ میں طوفان اٹھنے لگے اس کے دل میں حسب ذیل خیالات یکے بعد دیگرے گزرنے لگے:

لہ میرے نزدیک ملائکہ سے آدم کو سجدہ کرانا تعظیم خلیفہ کے علاوہ اسلئے بھی تھا کہ یہ ملائکہ ہی ہیں جو کائنات میں مخفی قوتیں بن کر پوشیدہ ہیں اور بحکم خدا تکوینی .... امور انجام دیتے ہیں پس ان سب سے سجدہ کرا دینے کا مطلب یہ تھا کہ اگر آدم ان ملائکہ (کائنات کی مخفی قوتوں) کو کوئی حکم دیں تو وہ سب بحکم حق آدم کے حکموں کی بھی تعمیل کریں مثلاً آدمی پہاڑ سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ مجھے چوکور یا لانبی پتھر کی پٹیاں دے اور چھینی اور ہتھوڑے کی زبان سے وہ یہ حکم پہاڑ کو سناتا ہے تو پہاڑ کو اس کی اطاعت کرنی اور اس کے حسب منشا پٹیاں دینی چاہئیں گویا یہ سجدہ "تسخیر کائنات" کی تمثیل و تعبیر ہے۔

"فرشتوں کو جب خلافت دینے سے انکار کیا گیا اُس وقت میں یہ سمجھا تھا کہ خلافت مجھے ملے گی افسوس وہ بھی نہ ہوا۔

...... میں اس خاکی ذلیل پُتلے سے عمر میں بڑا ہوں پھر میں بڑا ہو کر بھلا چھوٹے کے سامنے جھکوں؟ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔

...... افسوس میں اتنے علم کا مالک ہو کر بھی اس خاکی سے کم سمجھا گیا......

...... میں اتنی عبادت کرتا رہا جنّی اور ملکوتی قسم کی عبادتیں .... ان کی بھی قدر نہ کی گئی۔

.... میری اصل آگ ہے جو ایک جوہر علوی ہے پھر بھی مجھے ایک پتلۂ خاک کے مقابلہ میں جو سفلی ہے جھکنے کو کہا گیا!!

...... بھلا اس خاکی پتلے کے سامنے جھکنے کے بعد میری کیا عزت ملائکہ و جنّ کی نظروں میں رہ جائے گی؟

تفہیم [illegible] (ترجمہ)

..... خدا کا یہ حکم کچھ غلط معلوم ہوتا ہے" (معاذ اللہ) ان خیالات کے ہجوم میں کھویا ہوا وہ سجدہ سے رُکا۔ حق تعالےٰ نے پوچھا کہ "میں نے جس مخلوق کو اتنے اہتمام سے پیدا کیا جس کے اندر میں نے خاص روح پھونکی اور جس کے سامنے سجدہ کا میں نے تجھے حکم بھی دیا تو نے اُسے سجدہ کیوں نہیں کیا؟" ابلیس بولا۔ "میں اس سے بہتر ہوں آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اُسے مٹّی سے تو میں تو اسے سجدہ نہیں کروں گا" اللہ تعالےٰ نے فرمایا "اچھا؟ تو میرے حکم کے مقابلہ میں کبر کرنا چاہتا ہے؟ نکل یہاں سے! چل دور ہو!" خدا کی خفگی سننے کے بعد بھی ابلیس نہایت بدتمیزی سے کہنے لگا۔ "بہت اچھا! تو پھر آپ نے جو مجھے بھٹکایا ہے میں بھی اس کے بدلے اس خاکی کو اور اس کی اولاد کو بہکا کر رہونگا۔ ان کو ان کے داہنے سے بھی بائیں سے بھی آگے سے بھی اور پیچھے سے بھی میں بہکاؤنگا۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "جا تجھ سے جتنی کوشش ہو سکے کر دیکھ۔ میرے جو خاص بندے

ہوں گے وہ تیرے پھندے میں کبھی نہ پھنسیں گے"۔ ابلیس نے فوراً ہی ایک درخواست پیش[1] کی کہ "صور کے دوبارہ پھونکے جانے اور مخلوق کے مرنے کے بعد اٹھنے تک مجھے مہلت دیدیجئے کہ مجھے موت نہ آئے" اللہ تعالیٰ نے فرمایا "تیری یہ درخواست صرف "الیوم الاخر" اور نفخۂ اولیٰ ہی تک منظور کیجاتی ہے نفخۂ ثانیہ تک نہیں" اس کے بعد ابلیس جنت سے نکال دیا گیا۔ اس حکم اسجدوا سے حضرت آدمؑ کو ملائکہ و ابلیس کے نفوس کا تجربہ ہو گیا اور تعلیم اسماء کے نصاب دوم (خاص) کا ایک علم ان کو یہ ملا کہ ملائکہ کی صفت "لا یعصون اللہ ما امرھم" ہے اطاعت و تعمیلِ حکم ہے وہ باوجود معصوم ہونے کے متواضع ہیں۔
ابلیس کی صفت عصیان ہے۔ اباء و استکبار ہے وہ باوجود غیر معصوم ہونے کے متکبر ہے۔

اس کے بعد آدم حسب معمول جنت میں تنہا رہتے۔ جہاں چاہتے گھومتے مگر کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر کچھ غفلت سی طاری کر کے ان کے بائیں پہلو سے ایک ٹیڑھی پسلی نکالی اور اپنی قدرت اور حکمت سے اس سے ایک حسین و جمیل عورت کا قالب تیار کر کے اسمیں جان ڈالی اور ان کو عمدہ لباس سے آراستہ فرما کر آدمؑ کے پاس بٹھا دیا۔ حضرت آدمؑ کی اس تمنائے مبہم کو ایک شاعر نے بہت خوب ادا کیا ہے:۔

نظم

تنہائی سے اکتائی ہوئی فطرتِ آدمؑ
درگاہِ خدا میں ہوئی یوں محوِ مناجات
اے خالقِ جنت! ترے الطاف کے صدقے
اک پیکرِ خاکی پہ ہیں کس درجہ عنایات
جس چیز کی خواہش ہو بہ یک آن مہیا
یہ میرے سوالات کے برجستہ جوابات
لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ مرے آقا!
بے کیف گزرتے ہیں یہ کیوں زیست کے لمحات

---

[1] یعنی دعا کی۔ ابلیس دعا کی فضیلت جانتا ہے اس لئے اتنے بڑے گناہ کے بعد بھی خود تو دعا کی مگر مسلمانوں کو بہکا کر دعا سے روکتا ہے کہ "ارے بھلا تم گنہگار کا منہ ہے جو دعا کرو اور قبول ہو تو ایسے وقت میں لاحول پڑھنا اور پھر دل سے دعا مانگنا چاہئے ۱۲

ہر وقت کسی شے کی کمی ہوتی ہے محسوس
مطلوب "کوئی چیز" ہے بے نام و نشانات

ناگاہ نہاں خانۂ قدرت کا کھلا در — ہلکا سا تبسم تھا مشیت کے لبوں پر
اک جلوۂ نادیدہ مجسم نظر آیا — آئینۂ تخلیق کا کہئے جسے جوہر
پلکوں پہ حیا اور وہ سرمست نگاہیں — میٹھا سا رگِ جاں میں اترتا ہوا نشتر
اک پیکرِ خاکی میں نہاں حسن کی دنیا — اک چھوٹے سے قطرے میں محبت کا سمندر
دیکھا دلِ آدم میں جو طوفانِ تمنا — ارشاد کیا شانِ کریمی نے یہ ہنس کر
تو جس کا طلبگار ہے وہ جام یہی ہے — لیجا! کہ مرا آخری انعام یہی ہے

(فاروق بانسپاروی)

حضرت آدمؑ نے پوچھا "تم کون؟" جواب ملا "آپ کی بیوی" پوچھا "تمہارا نام" جواب ملا "حوا کہ آپ کے زندہ جسم سے میں پیدا کی گئی" پوچھا "آخر تمہارے آنے کا مقصد" جواب ملا "آپ کی دلبستگی"۔

[illegible]

اس کے بعد خدا نے آدم و حوا سے کہا۔ "تم دونوں اس جنت میں جہاں چاہو رہو جو چاہو جی بھر کر کھاؤ مگر اب دو حکم تم کو بھی دیئے جاتے ہیں ایک یہ کہ ابلیس تم دونوں کا دشمن ہے وہ میرے سامنے قسم کھا کر گیا ہے کہ میں ان دونوں کو بہکاؤں گا دیکھو کہیں وہ تمہیں یہاں سے نکلوا نہ دے۔ یہاں جنت میں تم کو بھوک پیاس نہیں ستاتی۔ تن ڈھانکنے کی فکر تمھیں نہیں کرنی پڑتی۔ دھوپ سے بچنے کے لئے مکان موجود ہے۔ ان راحتوں کی قدر کرو اگر تم یہاں سے باہر گئے کہ پھر تم کو یہ تمام فکریں خود کرنی پڑیں گی" دوسرے یہ کہ "وہ دیکھو اس درخت کے قریب نہ جانا"۔ یہ دونوں حکم سن کر وہ دونوں جنت میں آرام سے رہتے جہاں چاہتے وہاں گھومتے۔ جس درخت سے چاہتے پھل کھاتے مگر اس شجرۂ ممنوعہ سے دور ہی دور رہتے۔ ابلیس نے جب یہ خبر سنی کہ آدمؑ کو ایک درخت

سے روکا گیا ہے تو اسے یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح آدمؑ سے ملے تو ان کو بہکانے کی کوشش کرے۔ یہ سوچ کر وہ باہر ہی باہر جنّت کے پھاٹک پہ آیا اب اسے اتفاق کہئے یا ابلیس کی قوتِ خیالیہ جنیّہ کا اثر اور زور یا کسی کے ذریعہ بلوانیکا نتیجہ کہ آدم و حوّا بھی جنت کے اندر سیر کرتے کرتے اُسی وقت پھاٹک پر آگئے دونوں کا آمنا سامنا ہوا قریب تھا کہ آدم و حوّا ابلیس سے بے رُخی کر کے آگے بڑھ جائیں کہ ابلیس نے اُنس و نرمی سے ان کو سلام کیا آدم تھے انسان یعنی مجموعۂ انس و آن۔ سلام سنکر وہ بے رخی نہ برت سکے اُنھوں نے بھی جواب دیکر پھر بڑھ جانا چاہا کہ وہ فوراً کہنے لگا کہ "میں نے ایک بات سُنی ہے مجھے آپ کے اوپر بہت افسوس آرہا ہے۔" آدمؑ نے اپنے متعلق اتنا سنا تو اشتیاق و حیرت میں خدا کے حکم کو، اس کی یاد کو اور ابلیس سے تعوّذ کرنے کو بالکل بھول گئے۔ ابلیس نے بھی فوراً انکو اپنی باتوں میں لگا لیا کہنے لگا "کہ آپ کو شاید اب زیادہ دن جنّت میں رہنا نصیب نہ ہو گا۔ بہت جلد آپ کو یہ جنّت اور یہ نعمت، دیدارِ حق کی لذّت، قربِ حق کی عزت چھوڑنا پڑیگا ...... (پھر کچھ دردناک لہجہ بنا کر) .... افسوس! میں ہی جانتا ہوں کہ ہجر و فراق کیسی تلخ چیز ہے؟ جب سے حق تعالیٰ مجھ سے ناخوش ہو گئے ہیں مجھ پر کھانا پینا حرام ہے بس غم کھانے اور آنسو پینے سے کام ہے۔ آہ! فراقِ محبوب کیسی سخت چیز ہے؟" یہ کہہ کر وہ رو دیا۔ آدم و حوّا ہمہ تن اس کی لچھے دار باتیں سننے میں لگے تھے فراقِ محبوب کی خبر سن کر وہ بھی گھبرا گئے ابلیس نے موقع نہ دیا کہ اُن کا ذہن خدا کی طرف متوجہ ہونے پائے فوراً کہنے لگا۔ "خیر میں تو سخت جان ہوں جو کچھ مجھ پہ گزر رہی ہے اسے کسی نہ کسی طرح جھیل جاؤں گا مگر شاید آپ لوگ اسکا تحمّل نہ کر سکیں" ابلیس کا تلبیس سے رونا اور فراقِ حق کا ذکر کرنا اور آدم و حوّا کی ہمدردی کرنا اور قربِ حق سے محرومی کی خبر دینا سُن کر اُن کا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا وہ پہلے انسان تھے دنیا کے چھکے پنجے سے واقف نہ تھے اور معصوم فرشتوں کی صحبت میں رہ کر وہ اور زیادہ سب کو نیک سچا سمجھنے لگے تھے۔ یہ سُن کر اُن کے چھکے چھوٹ

گئے۔ ابلیس نے ادھر بھانپ لیا کہ مچھلی کانٹا نگل گئی ہے اب اسکا پھنسنا یقینی ہے فوراً کہنے لگا "لیکن اگر شجرۃ الخُلد کا پھل آپ لوگ کھالیں تب البتہ فرشتوں کی طرح ہمیشہ یہیں رہ سکتے ہیں اور اس ہجر کی مصیبت سے بچ سکتے ہیں"۔ آدم و حوّا اسوقت ایک حیران کن دوراہے پر کھڑے تھے ایک طرف وہ ابلیس کا گستاخانہ مکالمہ بھی حق تعالےٰ کے سامنے سُن چکے تھے اور اب وہ سُن رہے تھے کہ وہ اپنے کو خدا کا عاشق بتا رہا ہے اور غمِ فراق میں رو رہا ہے آخر کس بات کا یقین کریں؟ اسی طرح ایک طرف ان کا دل قربِ حق سے دوُر اور دیدِ حق سے مہجور رہونا نہیں چاہتا تھا اور دوسری طرف اس مصیبت سے بچنے کی صورت ایک دشمن بتا رہا ہے آخر کیا کریں؟ آخر ہمت کر کے بولے" ارے تو؟ اور ہماری مدد کرے گا؟ بس رہنے دے اپنی خیر خواہی!" ابلیس نے دیکھا کہ یہ تو ہتھے سے اکھڑے جاتے ہیں تو اُس نے بھی اپنے ترکشِ شیطنت کا آخری تیر چھوڑا۔ تیز ہو کر کہنے لگا۔" واہ جناب واہ! میں تو آپ کی خیر خواہی کروں اور آپ میری خیر خواہی پہ شبہہ کریں۔ خوب خدا کی قسم! میں آپ دونوں کی ہمدردی میں کہہ رہا ہوں کہ آپ عنقریب جنت سے ہٹا دیئے جائیں گے۔ ہاں شجرۃ الخُلد کا پھل آپ کھالیں تو امید ہے کہ آپ فرشتہ بن کر یہیں رہ سکیں گے۔ آئیے میں آپ کو شجرۃ الخلد یہیں سے دکھا دوں۔ وہ دیکھئے وہ بڑے درختوں کے پاس وہ چھوٹا سا جو درخت ہے وہ ہے "شجرۃ الخُلد"

ابلیس سے خدا کی قسم کا لفظ سننا تھا کہ آدمؑ کے قصرِ ایمانی اور قلعۂ محبت میں زلزلہ سا آگیا وہ سوچنے لگے:

"ارے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کی قسم!.... کیا یہ قسم غلط کھائی گئی ہے؟ کیا کوئی شخص خدا کی شہادت غلط طور پہ بھی دینے کی ہمت کر سکتا ہے؟ نہیں.... ہرگز نہیں...... یہ قسم غلط نہیں ہو سکتی!.... مجھے اسکا اعتبار کرنا چاہیئے.... مگر... یہ تو میرا دشمن ہے! مجھے تو اس کے کہنے میں آنے سے روکا گیا ہے..... پھر کیا کرنا چاہیئے؟..... مجھے دشمن

پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے .... لیکن .... قسم .... خدائے پاک کی قسم کا کیا حق ہے؟ کیا میں اسکا بھی اعتبار نہ کروں؟ .... کیا مجھ سے باز پرس نہ ہوگی کہ تم نے خدا کی قسم کے بعد بھی دوسرے کے کاذب ہونے کی بدگمانی کیوں کی؟ ...... ارے .... اب سمجھ میں آیا .... غالباً حق تعالیٰ کا مقصد یہ ہوگا کہ ابلیس کی کسی عام گفتگو پہ اعتبار نہ کرنا .... قسم والی بات کا چونکہ کوئی ذکر نہیں فرمایا اس لئے یہ صورت مستثنےٰ اور مسکوت عنہ ہے۔ قسم پہ تو اعتبار کرنا ہی چاہیئے .... بس بس یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ خدا کی قسم کے ساتھ کہی ہوئی بات اس ممانعت سے مستثنےٰ ہے"

غرض آدم کے اجتہاد نے یہ فیصلہ کیا کہ "یوں تو مجھے ابلیس کی باتوں میں نہ آنا چاہیئے اور نہ آؤنگا مگر قسم کی بات تو ضرور ماننی چاہیئے۔ خدا کی غلامی اور اس کی محبت کا تقاضا یہی ہے۔ دشمن اگر بالفرض مجھے اس معاملہ میں دھوکا بھی دے رہا ہے تو محبوب[1] کے نام پہ دھوکا کھالینا بھی مجھے پسند ہے" تاہم انھوں نے ابلیس سے فرمایا کہ خیر مجھے نہ تم

---

[1] یہاں ایک پیغمبر اور ایک صحابی کا واقعہ اور ایک مومن کا شعر درج کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ شعر تو حکیم مومن خاں مومن کا ہے کہ ؎ نہ مانوں گا نصیحت۔ پہ نہ سنتا میں تو کیا کرتا؟ ـ کہ ہر ہر بات پہ ناصح تمہارا نام لیتا تھا! صحابی حضرت عبد اللہ بن عمر رضؓ جب دیکھتے کہ ان کا کوئی غلام بہت خشوع خضوع سے نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور نمازی مومن کی عزت کے خیال سے اُسے آزاد کردیتے۔ غلاموں کو جب اسکا احساس ہوا تو کئی غلاموں نے بہت خشوع سے نماز پڑھنی شروع کی۔ حضرت ابن عمر رضؓ نے جب ان کی نماز دیکھی تو آزاد کردیا جب کئی غلام آزادی پاگئے تو کسی نے ان کو اطلاع دی کہ بعض غلام آزادی حاصل کرنے کے لئے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ "اللہ تعالےٰ کے معاملہ میں مجھے دھوکے میں آجانا ہی پسند ہے"۔

پیغمبر حضرت سیدنا عیسےٰ علیہ السلام کہیں تشریف لے جارہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک گھر میں نقب لگا رہا ہے آپ نے اُسے ڈانٹا کہ "کیوں جی؟ تم چوری کر رہے ہو؟" اس نے کہا "خدا کی قسم نہ میں چور ہوں اور نہ چوری کر رہا ہوں"۔ آپ نے خدا کی قسم جو سنی تو گھبرا کر فرمایا "اچھا بھائی اچھا! تم سچے ہو۔ میری آنکھیں ہی جھوٹی ہیں مجھے معاف کرو" یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

حضرت عیسےٰ پیغمبر علیہ السلام نے اور ابن عمر رضؓ صحابی نے بھی خدا کی قسم سنکر اور خدا کی اچھی نماز دیکھ کر جو دوسرے پہ یقین اور اعتبار کرلیا حالانکہ ان کے عہد میں جھوٹ۔ فریب وغیرہ خوب رواج پاچکا تھا تو یہ وہی محبت حق کا تقاضا اور سنت آدمؑ ہے پھر اگر آدمؑ نے ابلیس کی قسم پہ اعتبار کرلیا تو وہ نہ گناہ تھا نہ غلط وہ عین محبت حق کا تقاضا تھا۔ علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

فرشتہ بننا مقصود ہے اور نہ جنت کا عیش اٹھانا۔ میرا مقصود تو قربِ حق، رضائے حق اور دیدارِ حق ہے اور وہ یہیں مل سکتا ہے اس لئے میں شجرۃ الخلد کے پھل بھی کھالیتا مگر جس درخت کو تو شجرۃ الخلد بتا رہا ہے اُسی درخت سے تو مجھے حق تعالےٰ نے روکا ہے اس کے تو میں قریب بھی نہ جاؤں گا"۔ ابلیس یہ سنکر گھبرا سا گیا مگر یکایک اُسے ایک چال سوجھ گئی اس نے کہا۔ "جس درخت سے حق تعالےٰ نے آپ کو منع فرمایا ہے میں اُسے کھانے کو نہیں کہتا آپ اسکا پھل ہرگز نہ کھائیے مگر اُس کے پاس جو اور کئی درخت اُسی کے برابر اور اُسی طرح کے چھوٹے چھوٹے ہیں ان سب کا پھل کھانے کو تو خدا نے آپ کو منع نہیں کیا ہے ؟" انھوں نے فرمایا "نہیں مجھے تو ایک خاص درخت سے روکا ہے" ابلیس بولا "بس تو پھر آپ اُس درخت خاص کو چھوڑ کر اُس جیسے دوسرے درختوں کا پھل کھائیے" آدمؑ کو یہ تاویل صحیح معلوم ہوئی۔ اماں حوا نے بھی اس تاویل کی تصحیح کی اور اکل شجرہ کی ترغیب دی غرض دونوں نے اُدھر قدم اٹھائے جیسے جیسے اُن درختوں کے قریب ہوتے گئے ایک کشش ان دونوں کو تیزی سے اُن درختوں کی طرف گھسیٹے لئے جارہی تھی گویا یہ شعر ان کے حسبِ حال بنا ہوا تھا:

نہ میں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھکو ذوقِ عریانی
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو (اصغر گونڈوی)

درختوں کے قریب پہونچ کر اماں حوا ہی نے پہلے ہاتھ بڑھا کر پھل توڑا اور خود کھایا اور پھر انھیں نے حضرت آدمؑ کو بھی ترغیب دی حضرت آدمؑ اپنی رفیقۂ حیات کی اس پہلی پیشکش کو کیونکر ٹھکرا سکتے تھے ؟ آخر انھوں نے بھی کھایا۔ وہاں مسلسل کئی درخت تھے بس ایک خاص درخت کو تو انھوں نے چھوڑ دیا جس کی جانب وہ خدا کا اشارۂ ممانعت سمجھے تھے مگر اس کے علاوہ جتنے بھی درخت وہاں ایک قسم کے نظر آئے دونوں نے سبھی کے پھل یکے بعد دیگرے کھائے۔ سب کے پھل لذیذ اور ایک دوسرے سے مختلف۔ ایک میں گیہوں کا

مزہ تھا دوسرے[لہ] میں زیتون کا تیسرے میں انجیر کی لذت تھی تو چوتھے میں بادام کی۔ پانچویں میں انگور کا ذائقہ تھا تو چھٹے میں کھجور کا ساتویں میں چاول کا تو آٹھویں میں باجرے یا بتھئے کا۔ غرض یہ دونوں یکے بعد دیگرے وہ تمام پھل کھا رہے تھے کہ اچانک ان کے جسموں پر سے جنتی پوشاکیں اُترنی شروع ہوئیں۔ یہ انکشاف ان کے لئے بالکل نیا تھا لباس اُترنے سے انکو شرم وحیا دامنگیر ہوئی۔ گھبراہٹ میں ہر ایک اپنا بدن چُرانے چھُپانے لگا اس حالت میں اضطرار اً دونوں کی نگاہ ایک دوسرے کے بدن پر پڑ گئی اور تاریخ انسانیت میں پہلی بار آدم وحوا کو مرد وعورت کے جسموں کا فرق اور ایک دوسرے سے قُربت کی مبہم اور ناقابلِ فہم خواہش کا علم اور احساس ہوا۔ غیرت بھی زیادہ ہونے لگی تو اور بھی کوشش بدن چھپانے کی کرنے لگے زیادہ مصیبت ماما حوا کی تھی کہ ان کو کئی جگہ سے جسم چھُپانا پڑ رہا تھا۔ حالانکہ اسوقت وہاں صرف میاں بیوی ہی تھے اور دونوں کا ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہو جانا منع بھی نہیں تھا مگر انسان کا اور خاص کر عورت کا یہ جذبۂ فطری اتنا قوی ہوتا ہے کہ ایک سلیم الفطرت انسانی جوڑا تنہائی میں بھی بالکل ننگا ہو جانا گوارا نہ کرے گا چنانچہ حضرت ختم المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم کی قولی اور فعلی تعلیمات اس کے گواہ ہیں۔ بہرحال گھبراہٹ میں انھوں نے بادام کے پتوں پہ ہاتھ مارا اور انھیں کو توڑ کر اپنی اپنی شرمگاہوں پر رکھ لیا۔ تاریخ انسانیت میں پہلی بار ضرورت کے پیٹ سے ایجاد نام کی یہ بیٹی پیدا ہوئی یہ تعبیر تو اہل فلسفہ کے رنگ میں ہے لیکن زیادہ صحیح تعبیر مذہبی تعبیر ہے کہ حق تعالےٰ کے الہام اور غیبی اشارہ سے آدم وحوا نے یہ ایجاد کی دونوں نے جب اس طرح کچھ ضرورت پوری ہوتے دیکھی تو دوسرے الہام اور

لہ - میرے نزدیک آدم وحوا نے کئی بلکہ تمام درختوں کے پھل کھائے یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے تعین شجرہ میں ان تمام درختوں کا ذکر فرمایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ کسی شجر کی تعین نہ کرنی چاہئے۔ بعض نے اسے شجرۃ العلم کہا ہے کہ اس سے آدم کو علوم ملے یعض نے لکھا ہے کہ وہ ایسا درخت تھا جس کے کھانے سے پیشاب پاخانہ جماع کی حاجت محسوس ہوتی تھی ۱۲

غیبی اشارہ سے پتوں کو باہم جوڑ کر عارضی پردہ پوشی بنا لینا بھی سمجھ میں آ گیا۔ یہ دونوں ابھی اس ستر پوشی کی پہلی ایجاد و دریافت میں مشغول ہی تھے کہ حق تعالےٰ کی جلال بھری آواز آئی:-

"کیوں جی آدمؑ! کیا میں نے تم دونوں کو منع نہیں کر دیا تھا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا اور اُس نافرمان شیطان سے جو تم دونوں کا کھُلا دشمن ہے ہوشیار رہنا؟"

ارشاد خداوندی سنکر آدم و حواؑ کو پہلی بار یہ علم و احساس ہوا کہ دشمن کی قسم پہ اعتبار کرنے ہی کا یہ اثر ہوا کہ لباس اُتر گیا۔ اور حق تعالےٰ ناخوش ہو گئے۔ اُس وقت کی ان دونوں حضرات کی خستگی اور شکستگی بیان سے باہر ہے لباس اُترنے سے حیا و غیرت الگ دشمن سے زک اُٹھا جانے کی خفت الگ۔ بے ارادہ نافرمانی خدا کی ندامت الگ اور سب سے بڑھ کر حق تعالےٰ کے عتاب کی خجلت الگ۔ ان متعدد جذبات نے ان پر یک لخت رقت و خجلت عجز و انکسار کا ایسا قوی حال طاری کر دیا جس کا ان کو اس سے قبل کوئی علم اور تجربہ نہ تھا۔ زبان خشک ہو گئی گھگھی بندھ گئی آنکھیں زمین میں گڑ گئیں۔ آنسو بہنے لگے۔ رنگ زرد ہو گیا۔ کلیجہ منہ کو آنے لگا اور انتہائے تضرع و ابتہال میں وہ دونوں سر بسجود ہو گئے۔ انسانیت کو پہلی بار شہوات کی طرف میلان۔ ممنوع اور حرام کی شدید حرص۔ نافرمانی کا ادراک قلب کی سوزش۔ ندامت کے آنسو۔ اعترافِ جرم کی چپ۔ دہشت غموم کا ہجوم۔ عقل کی گریز پائی عشق کی کارفرمائی وغیرہ کا علم اور تجربہ ہوا اور عجیب تر یہ کہ یہ سب تجربات اُسی شجرہ ممنوعہ کے طفیل میں اور اسی عصیان گندم خوری کی بدولت ہوئے سچ کہا ہے کسی دل جلے آدمی نے کہ:

~ تر دامنی پہ شیخ! ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

بہر حال ابھی یہ دونوں اسی حال کے زیر اثر ہی تھے کہ ربّ کریم و رحیم نے پھر پوچھا۔

"چپ کیوں ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟ میں نے جب تم دونوں کو اس درخت کے قریب جانے سے منع کیا تھا تو تم اس کے پاس کیوں گئے؟ تم کو میرے منع کرنے کا بھی پاس نہ آیا؟"

ایک بچہ جب پہلی بار والدین کی نافرمانی کر بیٹھتا اور اپنے اوپر ان کا عتاب انکی غضب آلود

نگاہیں دیکھتا ہے تو چپ ہو کر سر اور نظر نیچے ہی جھکا لیتا ہے اور ٹوکنے پر رو ہی دیتا ہے۔ پہلی غلطی پر نہ وہ تاویل اور عذرِ گناہ کرتا ہے نہ صفائی پیش کرتا ہے یہ وہی خصلتِ آدم ہے آدم و حوا بھی عتاب کے تلخ گھونٹ گوارا کرتے رہے زبان سے نہ بول سکتے تھے نہ بولے۔

اس مرحلہ پر حق تعالیٰ نے ان کی اس خموشی کو اعترافِ جرم کا اور ان کی ندامت، شکستگی اور افتادگی کو توبہ کا نام عطا فرمایا اور اس توبہ کو قبول بھی کر لیا اور رحمت کا دروازہ اُن کے لئے دوبارہ کھولنے کے لئے خود فرمایا: "اچھا! دونوں اپنے جرم کا اقرار کرو اور یوں کہو کہ "واقعی ہم نے خود اپنا بڑا نقصان کر لیا آپ ہمیں معاف کر دیجئے۔ اگر آپ معاف نہ کریں گے اور پہلے جیسی شفقت اور رحمت ہم پر نہ کرنے لگیں گے تو ہمارا تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔" اتفاق سے یہی اُن دونوں کے دلوں کی آواز بھی تھی دونوں نے دل سے انھیں الفاظ میں اقرارِ جرم اور سوالِ رحم کیا۔ خدا نے ان کا قصور معاف فرما دیا اور پہلے سے زیادہ ان کو محبوب و مقرب، مجتبیٰ و مصطفیٰ بنا لیا اور پہلے سے زیادہ عنایات ان پر ہونے لگیں۔ قرآن نے اس بات کو اس آیت میں "ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ" (اس پر اللہ نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا)[1] اور اس آیت میں "اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ" میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت آدم نے اسی مرحلہ پر صفی اللہ کا لقب پایا ہے

بہ بیں کرامتِ رندانِ معصیت پیشہ — کہ آہ کردہ بہ یزداں قریب تر گردند (معراج)

مولائے رحیم کو جب راضی اور مائل بکرم دیکھ لیا تب حضرت آدمؑ نے دبی زبان سے معذرت میں عرض کیا کہ "پروردگار! قصوروار بیشک ہوں۔ اسکا اعتراف پہلے بھی کر چکا اب بھی کرتا ہوں۔ یہ آپ کا خاص ذوقِ کرم ہی ہے جس نے اس سرافگندہ کو سربلند اور اس بے قدر کو

۱؎ اس سے حق تعالیٰ کی مراد جو کیفیت بھی ہو میرا اُس پر ایمان ہے۔ اس کی تو تفسیر یا تاویل میں نہیں کرنا چاہتا مگر ہم انسانوں میں اس موقع کے سلوک و برتاؤ کی تعبیر ان الفاظ میں کی جایا کرتی ہے: "انکو سینہ سے لگا لیا۔ ان کو کلیجہ سے لگا لیا۔ انھیں گلے سے لگا لیا انھیں لپٹا لیا ۱۲

ارجمند بنا دیا تو یہ قبول کر لی اور رحم و کرم سے نوازا۔ اگر یہ تین معذرتیں بھی سن لیجئے: اوّل یہ کہ ابلیس نے آپ ہی کے نام پاک کی تو قسم کھائی تھی پھر میں آپ کا نام پاک اور آپ کی قسم سُن کر اسکا اعتبار کیسے نہ کرتا؟ دُشمن پہ اعتبار یقیناً غلطی تھی مگر اسکا منشا آپ ہی کے نام اور حوالہ کی عزت رکھنا تھا! اس گناہ کی وجہ تو یہ ہوئی دوسرے یہ کہ شجرۃ الخُلد کی حرص میں نے حفظِ نفس کے لئے نہیں کی تھی اس کا منشا کچھ اپنا ضعفِ قلب بھی تھا کہ اس در سے دوری برداشت نہ ہو سکے گی در اصل آپ ہی کی محبت میں بے اختیارانہ اسکا پھل کھا لیا۔ تیسرے یہ کہ پھل کھانے میں پہل میں نے نہیں کی تھی حوّا نے کی تھی اور انھیں کے اصرار و ترغیب سے میں نے بھی کھا لیا ان کی ترغیب کو رد کرنا میرے دل سے نہ ہو سکا۔" حق تعالےٰ نے محبت کے انداز میں جواب دیا:-

"اجی بس جاؤ بھی - یہ تو ٹھیک ہے کہ تم نے قصداً نافرمانی نہیں کی۔ لیکن اگر تم ابلیس سے گفتگو کرتے وقت ذرا غور و تامل کو کام میں لا کر ہم کو بھی یاد کر لیتے ہم سے مدد اور پناہ مانگ لیتے تو یہ بات نہ ہونے پاتی اس وقت تو تم مجھے بھول کر خود اپنی عقل اور طاقت کے بل پہ اُس سے نمٹنے کی کوشش کرنے لگے اس نے تم کو اور زیادہ اُلجھا لیا۔ رہی میری قربت تو یاد رکھو کہ میرا قرب صرف جسمانی نہیں رُوحانی بھی ہوتا ہے بظاہر دور رہ کر قلب و روح سے بھی میرا قرب ممکن ہے تم نے قرب کو جسمانی سمجھا اور اسی کو مقصود بنا لیا یہ بھی تمہاری اجتہادی غلطی تھی ؏

"قُرب کی راہوں میں میری راہ اک دُوری بھی ہے" میرا دیدار جہاں مشاہدہ ہے وہاں مراقبہ بھی ہے اب تیسری معذرت کا حال سنو۔ حوّا کو میں نے تمہارا "دل بہلاؤ" بنایا ہے اور تم کو حاکم۔ تم کو لازم تھا کہ خود اُن کے قوّام بنتے اور انھیں اپنے کہنے میں رکھتے نہ یہ کہ تم تابع بن گئے اور ان کو اپنا متبوع بنا لیا۔ خود سوچو کہ وہ تو تمہارا جزو ہے۔ اصل اور حاکم اور متبوع تو تم تھے۔ پھر کل کیوں جزو کا تابع بنے؟"

---

۵۱ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین ارشادات یہاں بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:- (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس طرح آدمؑ کو اسی شجرہ کی بدولت پہلی بار علم ہوا کہ شیطان[1] کے اثر سے پیغمبر بھی محض بحفاظتِ حق ہی بچ سکتے ہیں اس لئے غیر پیغمبر کو تو ہر وقت شیطان اور نفس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہئے اور اپنے حالات کو اپنی عقل کے بل پر حل کرنیکا خیال چھوڑ کر تفویض اور تعویذ (تعوذ) سے ہر وقت مسلح رہنا چاہئے اور یہ کہ خدا کا قرب صرف جسمانی نہیں روحانی بھی ہے اور یہ کہ عورت[2,3] کو تابع رکھنے میں مرد کی فلاح ہے اور اسے متبوع بنانے میں تباہی۔

بہر حال اِدھر ابلیس منتظر تھا کہ اب آدم پر بھی اس نافرمانی پہ ڈانٹ پڑنے والی ہے کہ یکایک اُسے خبر ملی کہ وہ تو رو کر اور سجدہ میں گر کر پہلے سے بھی کچھ زیادہ ہی محبوب اور رحم و کرم سے مالا مال ہو گئے تو اسے بہت رنج ہوا کہ میں محروم ہوا تو یہ مرحوم کیسے ہو گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ معصیت میں نے بھی کی اور آدمؑ نے بھی کی پھر یہ ایک ہی چیز کے دو جداگانہ اثر اور ایک ہی بیج کے دو مختلف ثمر کیسے پیدا ہو گئے؟ وہ لذتِ آہ و نالہ اور ذوقِ سجود سے بالکل ناواقف تھا اُسے خبر نہ تھی کہ ع "گندہ حرف نگیں از سجدہ میگردد درست" تخم معصیت ہی کا سہی لیکن اگر اخلاص کی زمین میں اُسے اشکِ ندامت کا پانی اور سر افگندگی کی ہوا بھی ملجائے تو اس آب و ہوا کا خاصہ ہے کہ پھر اس پہ فضل و رحم کے ثمر آنے لگتے ہیں۔ اُس نے تو سمجھا تھا کہ آدم کا بھی معصیت پہ ڈانٹا جانا اتنا ہی یقینی ہے جتنا علم الحساب میں دو ضرب دو (۲×۲) کے جواب میں چار کا ظاہر ہونا مگر آدم کی معصیت کے معاملہ میں تو گویا یہ حسابی حقیقت اس صورت میں تبدیل ہو گئی کہ دو ضرب دو برابر ہے منفی پانچ کے (۲×۲ = –۵) اس کو اپنی تدبیر پہ اعتماد تھا وہ تقدیر سے بے خبر تھا۔ طُرفہ تر یہ کہ ایسا ہی تجربہ اُسے نہ معلوم کتنی بار ہوا ہوگا مگر وہ کبھی ہمت نہیں

۱۔ فرمایا "اگر حوّا نہ ہوتیں اور ان کا طرزِ عمل ظہور میں نہ آتا تو کوئی عورت اپنے شوہر کی خیانت و مخالفت نہ کرتی (بخاری) ۲۔ فرمایا "اے عورتو! میں نے تم سے بڑھ کر کسی کو ایسا نہ دیکھا جو اچھے خاصے سمجھ دار مرد کو (اپنی محبت کے بیجا دباؤ سے) بیوقوف بنا دے (بخاری) ۳۔ فرمایا:۔ "وہ (فرد یا گروہ) کبھی فلاح نہیں پا سکتا جو اپنا سربراہِ کار عورتوں کو بنائے (بخاری)

ہارتا اور اپنی گمراہ کن تدبیروں سے باز نہیں آتا۔ مولانا روم لکھتے ہیں کہ ایک بار ابلیس نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت سیدنا الامام امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے تہجد قضا کرا دی۔ حضرت امیر صبح کو تہجد کے فوت ہونے پر بہت روئے اور بہت دیر تک استغفار فرماتے رہے حق تعالیٰ نے فرشتہ کاتب اعمال کو حکم دیا کہ ان کی تہجد ادا ہی لکھ لو اور معمول کے ثواب سے کچھ زائد ثواب بھی لکھ لو۔ دیکھئے یہاں بھی اس کے حساب کی صورت وہی (۲×۲ = ۵) بنگئی۔ خیر بقیہ قصہ بھی سن لیجئے۔ فرشتے اس حکم حق کا باہم چرچا کر رہے تھے کہ آج حضرت معاویہ کو انعام ملا۔ ابلیس نے کہیں سُن لیا تو اُسے بڑا صدمہ ہوا دوسرے دن اُس نے جناب امیر کو آدھی ہی رات سے جگانا شروع کیا کہ اٹھئے تہجد پڑھ لیجئے۔ آپ نے بیدار ہو کر پوچھا تو کون ہے؟ اُس نے کہا ابلیس۔ آپ کو سخت حیرت ہوئی اور آپ نے پوچھا کہ "ارے تو اور نماز کی ترغیب؟ یہ کیا قصہ ہے؟ سچ سچ بتا!" اس نے کہا "یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں آپ لوگوں کا عدو مبین ہوں تو میری عداوت اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ آپ کو کسی کام میں زیادہ ثواب یا زیادہ قرب خداوندی ملے۔ میں نے کل آپ کی تہجد قضا کرائی تھی اور خوش تھا کہ آپ کو میں نے حق تعالیٰ سے دور کر دیا مگر مجھے وثوق کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ آپکے استغفار و ندامت سے آپ کو ادائے تہجد کا ثواب مع زیادتِ قرب کے مل گیا اس لئے میں اب اسی پر راضی ہوں کہ آپ وقت پر تہجد پڑھ لیا کریں اور وہی عام ثواب لے لیا کریں۔ میں آپ کو زائد ثواب ملتا نہیں دیکھ سکتا۔"

(انتباہ) بعض ارباب سیر نے لکھا ہے کہ حضرت آدمؑ دنیا میں تشریف لانے کے بعد جب عرصہ تک روئے ہیں تب اُن کا گناہ معاف ہوا ہے۔ میرے ذوق میں یہ صحیح نہیں ہے۔ میرے نزدیک ان کی توبہ جنت ہی میں قبول ہو چکی تھی وہیں ان کی خطا (اگر واقعی وہ کوئی قابل مواخذہ خطا تھی تو) معاف ہوئی وہیں ان پر مزید نظر کرم و رحمت ہوئی اور ان کی ترقی درجہ ہوئی۔ آیت "فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ ثُمَّ هَدٰى" سے میں

یہی سمجھا ہوں۔ میرے نزدیک اُن کا دنیا میں آکر رونا گناہ بخشوانے کے لئے نہیں بلکہ حسب ذیل وجوہ سے تھا (الف) وطن اور دار مسکونہ چھوٹنے پر غم طاری ہونا فطری ہے اور تمام جانداروں میں مشاہدہ ہے آدم سے بھی ان کا وطن اور دار مسکونہ جنت چھوٹ گیا تھا (ب) وہ سمجھ رہے تھے کہ اب میں قرب حق اور دیدِ حق سے شائد محروم ہو جاؤں گا۔ اس وقت تک اُن کے ذہن نشین یہ بات نہیں ہونے پائی تھی کہ اب حق تعالیٰ اپنا جمال اپنی مصنوعات کے آئینہ میں دکھائیں گے اور اپنا قرب، ادائے فرائض کے ذریعہ عطا فرمائیں گے۔ (ج) وہ قیام جنت کو اپنا عروج سمجھتے تھے اور زمین پر آنے کو نزول۔ یہ نکتہ اُن کے ذہن میں نہ آیا تھا کہ عروج کا حاصل ولایت ہے اور نزول کا نبوت اور نبوت کا درجہ ولایت[1] سے بڑھ کر ہے (د) وہ غلبۂ حال میں معصیتِ مغفورہ کو یاد کرکے روتے تھے۔ یہی سنتِ آدم تھی جسکا نمونہ حضرت داؤد علیہ السلام میں بھی نظر آتا ہے۔ ان دونوں حضرات میں باہم مناسبت تھی۔ دونوں خلیفۂ حق بنے اور دونوں خطا کی معافی کے بعد گریۂ شکر اور گریۂ خشیت کے قوی حال و مقام میں تھے۔

۵ ۔ بہرحال آدم و حوا مغفرت کے بعد جنت میں زیادہ نہیں رہے۔ چونکہ وہ شجرۂ حدث کے پھل کھا چکے تھے اس لئے ان کو کچھ کچھ دیر کے بعد کچھ مبہم احساسات ہونے لگے کہ یکایک علیم و خبیر خدا کا یہ ارشاد سنا "اھبطوا" اُترو اور تم تینوں اب زمین پر جاؤ اور اے آدم و حوا پھر سُن لو کہ ابلیس تو تمھارا دشمن ہے ہی تم بھی اس کے دشمن بنو اور اس سے چوکنا رہو البتہ میں جب دنیا میں تمہاری بے راہ روی دیکھوں گا تو

---

[1] یہاں ایک لطیف بات عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ نبوت اُسی ولایت سے افضل ہے جو انسان یا ملائکہ میں ہو اور حضرت مجدد الف ثانی کے ارشاد کا محل یہی ہے مگر ایک ولایت خود ذات حق میں بھی ہے جسکا ثبوت، آیت "اللّٰہُ ولیّ المؤمنین" میں ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات پاک میں بھی ولایت کی ایک فرد ہے جو مومنین پر متوجہ ہے کہ نبوت اسی کے تقاضے سے ہے۔ پس یہ ولایت جو ذات حق میں ہے اسکا درجہ یقیناً نبوت سے بڑھ کر ہے انھیں معنوں میں شیخ اکبر نے کہا ہے الولایۃ افضل من النبوۃ ۱۲ والحمد للّٰہ علیٰ ہذا العلم البدیع۔

ہدایت کے لئے وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت اپنے پیغامات، انسانوں ہی میں سے اپنے
خاص بندوں کے ذریعہ تمہارے پاس بھیجتا رہوں گا۔ تم کو اور تمہاری ذریت کو چاہیئے کہ
میرے پیغاموں کی پیروی اور میرے پیغامبروں کی عزت کریں۔ جو ان کی پیروی کریگا اُسے
تو کچھ ڈر کھٹکا نہیں لیکن جو اس کے خلاف کرے گا تو وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے جہنم میں ڈالدیا
جائیگا بہر حال اب تم اترو اور جلد یہاں سے باہر جاؤ کیونکہ اب جو حالات تمہیں یہاں
پیش آئیں گے اُن کا یہاں انتظام نہیں۔"

غرض آدم و حوا کو اور ابلیس کو آسمان سے زمین پر اُتار آگیا مگر سب کو الگ الگ۔
آدمؑ سر جھکائے حق تعالےٰ کو یاد کرتے لنکا میں آتارے گئے۔ ماما حوا کو جدّہ (عرب)
میں اُتار اگیا وہ بھی سر جھکائے تھیں۔ ابلیس کو اُبلہ (عراق) میں اُتار اگیا وہ اُترتے
وقت اکڑتا ہوا سر اونچا کئے ہوئے تھا۔ اور" ابلیس کی بیوی (؟) سجستان میں اتاری
گئی" (روح المعانی) حضرت آدمؑ کے ساتھ جنت سے حجرِ اسود۔ مختلف پھل
پھلوں اور غلوں کے بیج اور خوشبودار پھول اور پودے بھی دنیا میں اُتارے گئے
(ابن کثیر سورۃ بقرہ) زمین پر پہونچنے کے بعد حضرت آدمؑ کو پاخانہ کی حاجت پہلی بار محسوس ہوئی
اس کی ابتدائی مبہم تکلیف تو انھیں جنت ہی سے محسوس ہونے لگی تھی اسی پر حق تعالےٰ کا
حکم " اھبطوا " ہوا تھا مگر چونکہ آدم کے لئے قضاء حاجت کا تجربہ بالکل نیا تھا اس لئے
گھبرائے تو بہت مگر ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ترکیب کریں کہ پیٹ کی اس تکلیف سے
نجات پائیں؟ آخر حق تعالےٰ نے رفیق الانبیاء۔ واسطۃ العلم حضرت جبرئیل علیہ السلام کے
ذریعہ ان کو ہدایت بھیجی کہ اس تکلیف سے نجات پانے کے لئے اس طرزِ نشست سے
بیٹھو چنانچہ انھوں نے حسبِ ہدایت بیٹھ کر اس سے فراغت حاصل کی ( )
کچھ دنوں لنکا میں گزارنے کے بعد آپ الہام کی رہنمائی سے اپنی رفیقۂ حیات حوا کی تلاش
میں ہندوستان وغیرہ سے گزرتے ہوئے جدّہ (عرب) پہونچے۔ وہاں حوا سے ملاقات

اس سفر کی تفصیل اور حوا سے ملاقات کی سرگذشت اور کیفیت کہیں نظر سے نہیں گزری۔
بہرحال دونوں وہاں سے الہام کی رہنمائی میں مکہ شریف پہونچے اور وہیں رہنے بسنے لگے۔
حضرت اسماعیلؑ کا وہاں رہنا بسنا سُنتِ آدمی ہی تھی پھر حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم
کا وہاں رہنا اور بسنا بھی سنت آدم کی پیروی اور " اول بہ آخر " کی نسبت سے تھی۔
اس کے بعد آدم و حوا کی نسل چلی اور اسی کے ساتھ ساتھ ابلیس کی بھی نسل چلی۔
اسوقت سے حق تعالیٰ نے یہ دستور بنا دیا ہے کہ جب اولاد آدم میں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے
تو اُسی وقت ابلیس کے گھرانہ میں بھی مردم شماری بڑھتی ہے اور ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔
روح المعانی میں ہے کہ " جنوں میں سے جان تو ابو الجن اول تھا اور ابلیس ابو الجن ثانی
ہے جسطرح انسانوں میں آدم ابو البشر اول تھے اور نوح ابو البشر ثانی (سورہ اعراف)
دنیا میں آنے کے بعد آدمؑ کے لئے نیا دانہ نیا پانی۔ نئی ہوا۔ نئی فضا تھی جنت
(مکانِ مسکونہ) کے مقابلہ میں ویران اور سنسان دنیا جو ملی اور جنت کی بے فکری
اور آرام کی جگہ بھوک کی مشقت۔ پیاس کی اذیت۔ مینہ اور دھوپ کی کلفت، سفر
کی تکان جو ہوئی ان سب وجوہ سے حضرت آدم کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ اسی کے ساتھ آپ
خشیت حق سے اکثر روتے بھی تھے تو حق تعالےٰ نے آپ کو وحی سے ہر قمری مہینہ کی ۱۳۔
۱۴۔ ۱۵ تاریخ کو روزے رکھنے کا حکم فرمایا چنانچہ آپ نے ایام بیض کے روزے رکھے
اُس سے آپ کے چہرے پر پہلے جیسی رونق شگفتگی اور درخشانی آگئی اور آپ کے
قلب مبارک کو سکینہ اور نشاط حاصل ہوا اس پر آپ نے شکرانہ میں قبل طلوعِ آفتاب
دو رکعت نماز پڑھی جو ان کی امت کے لئے اور بعد والوں کیلئے نمازِ فجر کے نام سے فرض
کردی گئی [بقیہ نمازوں کی تاریخ ملا علی قاری نے مرقات باب مواقیت الصلوٰۃ میں یہ
لکھی ہے کہ نمازِ ظہر حضرت ابراہیمؑ کی۔ نماز عصر حضرت عُزیرؑ کی۔ نماز مغرب حضرت داؤدؑ
کی یادگار ہے اور نماز عشا نبی آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا نے عطا

فرمائی ہے] قیام مکہ[۱] ہی کے زمانہ میں حضرت آدمؑ کو منصب "نبوت و رسالت" عطا ہوا حضرت جبریلؑ آپ کے پاس خدا کی وحی لاتے تھے چونکہ انسانیت کی ابتدا تھی اس لئے حضرت آدمؑ پر جو وحی آتی تھی اُس میں معاش اور تمدن کے متعلق خدا کی طرف سے بہت زیادہ ہدایات ہوتی تھیں اور معاد و تدین کے متعلق بہت کم [اور یہ سلسلہ تعلیم تمدن و معاش کی وحی کا حضرت نوح کی بعثت تک جاری رہا حضرت نوح پہلے رسول ہیں جن پر وحی صرف معاد و تدین کے متعلق ہونے لگی توحید وغیرہ کے احکام میں سختی اور شرک پر سزا کی جانے لگی] چنانچہ حضرت آدم نے تعلیم وحی سے کھیتی بھی کی اور غلّہ پیدا کر کے کھایا ۔ آپ نے کپڑے بھی بنے پھر انھیں سیا اور پہنا ۔ غرض حضرت جبرئیلؑ نے آپ کو ہر صنعت سکھائی (ابن کثیر ج۱ ص۸)

حضرت آدمؑ کو ارباب سیر نے "نبیؑ مکلّم" لکھا ہے خیر اس میں کیا شک ہے ۔ نبی تو آپ تھے ہی مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ آپ رسول نہ تھے صرف نبی تھے ۔ میرے نزدیک آپ رسول و نبی دونوں تھے ۔ جب آپ پر نئی ابتدائی شریعت نازل ہوئی (جس کے بعض احکام ہم آخری باب میں لکھیں گے ۔) تو پھر آپ کے رسول ہونے میں کیا اعتراض ہے ؟

بہر حال آپ کے مکہ پہونچ جانے کے بعد "میثاق الست[۲]" پیش آیا اس کا مقصد یہ تھا کہ اب خلیفۃ اللہ اپنا کار منصبی شروع کرنے والے ہیں تو خود ان سے بھی خدا کی ربوبیت و وحدانیت اور شرک سے برات و نزاہت تسلیم کرائی جائے چنانچہ قرآن میں ہے کہ اتمام حجت

---

[۱] رسالت و نبوت کا عظیم الشان کام مکّہ ہی سے حضرت آدم سے شروع ہوا اور مکّہ ہی میں حضرت محمد پر (علیہما السلام) ختم ہوا اول الرسل و خاتم الرسل دونوں مکّہ ہی میں ہوئے ۔ [۲] بعض مفسرین نے خلق آدم کے فوراً بعد اسکا ہونا لکھا ہے بعض نے میثاق الست اور میثاق النبین کا ذکر اک ساتھ کیا ہے ۔ لیکن میرے نزدیک میثاق انبیا عالم ارواح کا اور خلق ارض و سما سے قبل کا واقعہ ہے اور میثاق الست دنیا کا اور حضرت آدم کے مکّہ پہونچ جانے کے بعد کا ہے ۔ ۱۲ س

کے لئے تمام بنی نوع انسان سے یہ میثاق لیا گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ ایک بار ۹ ذی الحجہ کو (اور غالباً جمعہ کا دن تھا) حضرت آدمؑ وادی نعمان یا میدان عرفات میں تھے کہ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند مسلّط فرما کر اُن کی پیٹھ سے ان کی اولاد کو پھر اولاد کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اسی طرح قیامت تک جتنے انسان پیدا ہونے والے تھے سب کو چیونٹی کے برابر جسموں کی شکلوں میں نکال کر جمع فرمایا۔ حضورؐ نے اس اجتماع کا ذکر اس حدیث میں فرمایا کہ: "الارواح جنودٌ مجنّدۃ الحدیث کہ جن روحوں کا منہ آمنے سامنے تھا وہی روحیں دنیا میں آکر باہم موافق اور ایک دوسرے کی دوست ہوں گی اور جن روحوں کی پیٹھ ایک دوسرے کی طرف تھی دنیا میں آنے کے بعد اُن میں باہم دشمنی رہے گی اور اگر ایک کی پیٹھ کی طرف دوسری کا منہ تھا تو دنیا میں آکر دوسری کو تو پہلی سے محبت اور دوستی ہوگی مگر پہلی کو دوسری کی طرف التفات نہ ہوگا" اوکما قال۔ بہر حال جب سب روحیں جمع ہولیں تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" "کیا میں تم سب کا رب نہیں ہوں؟" سب نے حق تعالےٰ کی ربوبیت اور وحدانیت اور معبودیت کا اعتراف کرنے اور حلفِ وفاداری اٹھانے کے لئے عرض کیا "جی ہاں! کیوں نہیں؟ آپ یقیناً ہم سب کے رب اور معبود ہیں" حق تعالیٰ نے فرمایا "اچھا تو دیکھو تم سب میری ہی غلامی کرنا کسی کو میرا شریک نہ بنانا"۔ یہ تھا میثاق الست! اس میثاق کے بعد حق تعالےٰ نے کچھ روحوں کو اپنے داہنے ہاتھ میں لیا۔ اسی لئے ان کا لقب "اصحاب الیمین" پڑا۔ ان کے متعلق فرمایا "ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے (اَللّٰھُمَّ یَا رَبِّ بِجَاہِ وَجْھِکَ الْکَرِیْمِ وَبِحَقِّ سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ عَلَیْہِ اجْعَلْنِیْ وَوَالِدَیَّ وَاَسَاتِذَتِیْ وَمَشَائِخِیْ مِنْھُمْ آمِین)

میرا شعر ہے: ؎ کیفِ گلبانگِ الست اور حالِ اہلِ دل نہ پوچھ
اب تک ان کا ہر بُنِ مُو گوش بر آواز ہے (سراج)

اور بعض روحوں کو اپنے بائیں ہاتھ میں لیکر فرمایا "ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور میں پروا بھی نہیں کرتا" ان کا لقب "اصحاب الشمال پڑا۔ سب کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مطلب یہ تھا کہ آج تو "میثاق الست" سبھی لوگ باندھ رہے ہیں اور حلف وفاداری سبھی اٹھا رہے ہیں گویا سبھی پارسا اور جنتی ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ان سب میں سے صرف اتنے ہی آدمی جنتی ہوں گے جن کو میں نے اصحاب الیمین بتایا ہے باقی سب لوگ دنیا میں جا کر علائق میں پھنسیں گے ۔ نفس کے میلان سے۔ گمراہ ماں باپ کی تربیت سے۔ شیطان کے اغوا سے۔ دوست اور زوج، اقارب اور معاشرہ کے دباؤ اور شرم سے۔ گمراہ حاکموں اور اقتدار والوں کے بیجا اثرات سے۔ گمراہ عالموں کی تعلیم سے گمراہ درویشوں اور فقیروں کی ارشاد سے غرض ان سات عوامل و مؤثرات سے (جن کے لئے جامع اصطلاح "طاغوت" ہے) یہ اصحاب الشمال جہنم میں جائیں گے (اَللّٰھُمَّ رَبِّ بِرَحْمَتِکَ الَّتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْئٍ لَا تَجْعَلْنِیْ وَ وَالِدَیَّ وَاَسَاتِذَتِیْ وَمَشَائِخِیْ مِنْھُمْ آمین)

اشخاص میں باہم مناسبت کا ایک ظہور آغاز آفرینش میں ہوا عالم غیب کا معاملہ ہونے کی وجہ سے حضرت صادق و مصدوق کی حدیث سے اس کی خبر معلوم ہوئی کہ الارواح جنودٌ الخ اس مناسبت باہمی کا دوسرا ظہور اس عالم شہود میں ہو رہا ہے جس کی تعبیر اہل ادراک نے ان الفاظ میں کی کہ "کند ہمجنس باہم جنس پرواز"۔ پھر اسی مناسبت کا تیسرا ظہور عالم حشر میں یقیناً ہونے والا ہے جس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں ہے اَلْفٌ یَوْمَئِذٍ یَصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا : ب یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا (اَللّٰھُمَّ اَلْحِقْنِیْ وَ آبَائِیْ وَ اَولَادِیْ وَمَشَائِخِیْ بِالصَّالِحِیْنَ)

اس اجتماع میں حضرت آدمؑ نے دیکھا کہ کوئی گورا ہے کوئی کالا کوئی بیمار کوئی تندرست کوئی امیر معلوم ہوتا ہے کوئی غریب تو پوچھا یارب یہ سب یکساں کیوں نہیں؟ جواب ملا "آپکی یہ ذریت یکساں اس لئے نہیں ہے کہ ان میں جو اپنے کو دوسرے کے مقابلہ میں بہتر حالت میں پائے وہ اسے میری نعمت سمجھ کر میرا شکر ادا کرے"۔ پھر آپ نے بعض کو نہایت

روشن رو دیکھ کر پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟" جواب ملا " یہ لوگ انبیا ہونے والے ہیں"۔ اس پوری کاروائی کے بعد حق تعالےٰ نے سب روحوں کو پھر اسی طرح اُن کے آبا کی پشتوں میں امانت رکھدیا۔

کچھ عرصہ بعد آپ نے حضرت جبرئیل کی مدد اور الہام ربانی سے دنیا میں پہلا انسانی گھر بنایا اور اُسے عبادتِ خدا کیلئے خاص کر دیا۔ یہ گھر عرب کے شہر مکہ میں "کعبتہ اللہ" کے نام سے آجتک مشہور ہے۔ حضرت آدمؑ نے خدا کے حکم سے جنت سے اُتارا ہوا حجرِ اسود کعبہ کے ایک کونہ پر لگا دیا گیا جو آج بھی موجود ہے۔

ماما حوا جن کے ساتھ حضرت آدمؑ کا نکاح حق تعالےٰ نے آسمان پر جنت ہی میں کر دیا تھا۔ مکہ میں آپ کے ساتھ تھیں ان کے بطن سے آپ کی چالیس اولادیں ہوئیں مگر چونکہ اکیلے انسان تھے اس لئے خدا نے دنیا کو بسانے کے لئے اپنی قدرت سے یہ انتظام کر دیا تھا کہ ہر مرتبہ کے حمل میں ماما حوا سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی توام پیدا ہوتی تھی اور یہ دونوں اُس شریعت میں سگے بھائی بہن سمجھے جاتے تھے۔ ان کا نکاح ایک دوسرے سے منع تھا لیکن جب دوسرے حمل سے پھر ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتی تھی تو آبادی بڑھانے کے لئے اس شریعت کا حکم تھا کہ پہلے حمل کے لڑکے سے دوسرے حمل کی لڑکی کا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ گویا حمل کا بدلنا خاندان کے بدلنے کے برابر تھا۔ ایکبار کے حمل میں ایک لڑکا قابیل نام اور ایک لڑکی اقلیما نام ساتھ پیدا ہوئی دوسرے حمل میں ایک لڑکا ہابیل نام اور ایک لڑکی .... نام ساتھ پیدا ہوئی تو بالغ ہونے پر حضرت آدمؑ نے قابیل کو ہابیل کی بہن سے اور ہابیل کو اقلیما سے بیاہنا چاہا۔ قابیل نے کہا میں اقلیما (اپنی سگی بہن) ہی سے بیاہ کرونگا۔ حضرت آدمؑ نے فرمایا کہ یہ خدا کے حکم کے خلاف ہے ایسا نہیں ہو سکتا پھر بھی قابیل نے نہ مانا تو حضرت آدمؑ نے یہی مسئلہ ایک حکمت سے اُسے سمجھانا چاہا اور ہابیل و قابیل دونوں سے فرمایا۔" اچھا تم دونوں اپنی اپنی کوئی محبوب چیز خدا کے

نام پر نذر کر کے فلاں میدان میں لا کر رکھو۔ میں خدا سے دعا کروں گا جس کی نذر خدا قبول کرے گا بس وہ اقلیما سے شادی کر لیگا۔ بولو تم دونوں خدا کے اس غیبی فیصلہ پر راضی ہوتے ہو؟" دونوں راضی ہوئے۔ قابیل تو غلہ کی کچھ خشک بالیاں نذر میں لایا اور ہابیل ایک عمدہ موٹا دنبہ لایا۔ آدمؑ نے دونوں چیزیں میدان میں رکھوائیں اور خود دعا میں مشغول ہوئے کہ یکایک ایک آگ ظاہر ہوئی۔ سب کی آنکھیں جھپک گئیں۔ جب آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ ہابیل کے دنبہ کو آگ اٹھا لے گئی۔ یہی علامت تھی نذر کے قبول ہونے کی۔ قابیل کے دل میں اس ہار جانے کی وجہ سے حسد اور غصہ پیدا ہوا اس نے ہابیل کو قتل کی دھمکی دی ہابیل نے کہا "تمہاری خفگی بلا وجہ ہے۔ اللہ تعالےٰ متقی ہی کی نذر قبول کرتے ہیں تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو اگر خدا کی مشیت یوں نہ ہوگی تو تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر میں تو تم پر کبھی بھی ہاتھ نہ اٹھاؤں گا"۔ مگر قابیل کا غصہ بڑھتا ہی گیا آخر اس نے ایک دن سوتے میں ہابیل کے سر پر ایک بھاری پتھر دے پٹکا جس سے اس کا بھیجا پاش پاش ہو گیا اور وہ شہید ہو گیا۔ دنیا میں یہ پہلے انسان کی موت تھی جو ایک عورت کے بارہ میں قتل کی شکل میں ظاہر ہوئی اس وقت تک چونکہ کسی انسان پر موت واقع نہیں ہوئی تھی اس لئے قابیل کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر اب لاش کو کیا کرے غرض وہ اس لاش کو پیٹھ پر لادے لادے پاگلوں کی طرح ہر طرف پھرتا تھا کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت آدمؑ کی عمومی برکت سے قابیل کو ایک تدبیر انسانی لاش کے متعلق بتلائی۔ اس نے دیکھا دو کوّے لڑے ایک نے دوسرے کو مار ڈالا پھر چونچ اور پنجے سے زمین کی مٹی ہٹا ہٹا کر ایک جگہ کچھ گڈھا سا بنا لیا اسی میں مردہ کوّے کو ڈال کر پھر چونچ اور پنجے سے ریت اور مٹی اس پر ڈال ڈال کر اسے زمین میں چھپا دیا۔ قابیل نے بھی اسی طرح مٹی کھود کر گڈھا (قبر) بنایا اور لاش اسمیں ڈال کر اوپر سے مٹی برابر کر دی۔ اس طرح دنیا میں پہلی انسانی لاش زمین میں دفنائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد قابیل پاگل

ہو کر مر گیا۔ آدمؑ کو ان دونوں کے خصوصاً ہابیل کے مرنے سے بہت رنج ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد حق تعالٰے نے ان کو دوسرا بیٹا شیث عطا فرمایا۔ حضرت آدم ان کو بہت چاہتے تھے۔ وہ آگے چل کر نبی ہوئے علیہما السلام۔

حضرت آدم علیہ السلام نبی و رسول تھے۔ آپ کا مذہب "اسلام" تھا مگر بالکل ابتدائی شکل میں اس وقت کے انسانوں کی حالت اور ضروریات کے مطابق۔ آپ کا اور آپ کی امت کا کلمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ آدَمُ صَفِيُّ اللّٰهِ" تھا علیہ السلام۔ آپ کی زبان جنت میں بھی اور دنیا میں آنے کے بعد بھی عربی تھی اور یہی آپ کی اُمت کی زبان بھی تھی اس لئے عربی ہی "اُمُّ الْاَلْسِنَةِ" ہے۔ حضرت نوحؑ تک سب کی زبان عربی تھی البتہ طوفان نوح کے بعد خدا کی قدرت سے ایک رات میں سب کی زبان بدل گئی کہ ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھتا تھا۔

وفات آپ کی وفات بھی جمعہ ہی کے دن مکہ شریف میں ہوئی اور روح مبارک رفیق اعلےٰ سے جا ملی اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ آپ کی عمر ۹۳۰ برس ہوئی۔ وفات کے وقت ماما حوا زندہ تھیں۔ انتقال کے بعد حضرت جبرئیلؑ نے آپ کو بیری کی پتّی کے پانی سے غسل دیا اور عمل کر کے حضرت شیثؑ کو انسانی لاش کے غسل کا طریقہ دکھایا اور سکھایا پھر حضرت آدم کی لاش مبارک سامنے رکھ کر پہلے فرشتوں کے ساتھ خود نماز جنازہ پڑھی اور حضرت شیثؑ کو نماز جنازہ دکھائی اور سکھائی جس میں چار تکبیریں کہیں (یہ نبی پر نماز جنازہ پہلے فرشتوں نے پڑھی) اس کے بعد حضرت شیث نے انسانوں کی جماعت سے حضرت آدم کی نماز جنازہ پڑھی پھر منا میں مسجد خیف کے وسط میں (غالباً قبہ میں) آپ کو دفن کیا گیا۔ اللھم صلّ علیٰ انبیانا وعلیہ وبارک وسلّم۔

حلیہ مبارک آپ کا رنگ گندم گوں سفیدی مائل تھا۔ قد لانبا ۶۰ ہاتھ کا تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال گھنے اور سیاہ تھے

خاتمۃ السوانح مسلمان عموماً حضرت آدمؑ کا ذکر یا تصور نہایت سرسری اور معمولی انداز سے کرتے ہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیگر انبیا علیہم السلام کا درجہ تو بہت بڑا مانتے ہیں اور حضرت آدم کی ذات، حیات، درجہ و مرتبہ کو کم جانتے ہیں ان کا ذکر بے اعتنائی و ناقدری سے کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی ذمہ داری تین گروہوں پر ہے۔

(الف) **گمراہ اہل تاریخ** انھوں نے ایک بے بنیاد قیاس کیا کہ "انسان پہلے وحشی اور غیر متمدن تھا رفتہ رفتہ وحشت اور بربریت سے تہذیب کیطرف اور جہل سے علم کیطرف آیا" حالانکہ ان کے پاس اس کا کوئی مستند و معتبر ثبوت نہیں۔ یہ خیال خود جاہلانہ ہے۔ انسان اول (علیہ السلام) تو ایک پیغمبر تھے۔ علم کا ذخیرہ تھے اسی علم میں وہ فرشتوں سے بہتر تھے اسی لئے فرشتے بھی اُن کے سامنے جُھکے وہ عمل کے پیکر، اخلاق کے مجسمہ، حیا و تہذیب کے نمونہ اول تھے اور یہ سب دنیا میں آنے کے ساتھ ہی تھے۔ یہ نہیں ہوا کہ وہ پہلے بے علم رہے ہوں پھر تجربات نے ان کو باعلم اور باعقل باسلیقہ اور باتہذیب بنایا ہو۔ دنیا میں پہلے انسان پر ایک لمحہ کے لئے بھی جہل و وحشت کا وقت نہیں گزرا۔

(ب) **گمراہ اہل فلسفہ** انھوں نے مادّہ (جماد) کو قدیم و باشعور مانا اور یہ سمجھا اور سمجھایا کہ انسان دراصل ایک ارتقائی شکل ہے مادّہ کی۔ بے شعور مادّہ ہی حیات کے زور سے لاکھوں برس میں مختلف مراحل سے گزرتا ہوا انسان بن گیا۔ ان دونوں گروہوں نے تو انسانیت کی ایسی سخت توہین کی ہے جو ناقابل معافی ہے انھوں نے انسانیت کے شرف اصلی کو خاک میں ملا دیا۔

(ج) **بے احتیاط مصنفین** انھوں نے حضرت آدمؑ کی گندم خوری کو گناہ بتایا۔ جنت میں ستر کھل جانے کو سزا بتایا۔ اُن کے دنیا میں آنے کو بھی سزا کہا۔ اگرچہ احقر نے اس رسالہ میں ابتک اس کا بڑا لحاظ رکھا ہے کہ

حضرت آدمؑ کا فضل و شرف، اہمیت و عظمت کما حقہ سب کو معلوم ہو جائے اور ہر جگہ اس پہلو کو نمایاں کرتا گیا ہے مگر پھر بھی اندیشہ ہے کہ آپ کے حالات میں منتشر طور پر بیان ہونے کی وجہ سے آپ کی تشریفات و تکریمات نمایاں اور مستحضر نہ ہو سکی ہوں اس لئے ان کو اجمالاً پھر شمار کئے دیتا ہے :۔

میرے نزدیک ابونا ابوالبشر، اول الرسل والنبیین، خلیفۃ اللہ فی العالمین، مسجودِ ملٰئکہ، پیکرِ علم، مجسمۂ عمل، انسانِ اوّل، محسنِ عالم، آدمیت و اخلاق کے قائدِ اول، رہنمائے تدین، رہبرِ تمدن، حضرت سیدنا آدم علیہ وعلٰے نبینا الصلوٰۃ والسلام کی تکریماتِ خاصہ حسبِ ذیل تھیں :۔

۱۔ تخلیقِ خصوصی[1]۔

۲۔ عرضِ امانت۔

۳۔ تعلیمِ اسما۔ (اس کا کچھ ذکر گزر چکا بقیہ باب سوم میں آرہا ہے)

۴۔ مسجودیتِ ملٰیکہ۔

۵۔ تلقیِ توبہ و تلقیبِ صفیؔ و مجتبےٰ و مصطفےٰ۔

۶۔ میثاقِ الست

۷۔ افتتاحِ تمدن و تدین[2] (اس کا ذکر باب چہارم میں آرہا ہے۔)

---

[1] روح المعانی (سورہ ص) میں ہے کہ "حق تعالےٰ نے صرف چار چیزیں اپنے دستہائے مبارک سے یعنی خاص تشریف و تکریم دینے کیلئے خاص التفات اور خصوصیت کے ساتھ پیدا کیں بقیہ کائنات کو لفظ کن کہہ دیا اور وہ پیدا ہو گئیں وہ چار چیزیں یہ ہیں۔ قلم۔ آدم۔ عرش۔ جنّات النعیم۔

یہاں ایک علمی اعتراض کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اعتراض و شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن تو کئی چیزوں کو بتاتا ہے کہ خدا نے انہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے پھر یہ حدیث کیونکر صحیح مانی جائے اور پھر انسان کی ایسی تخلیق و تشریف کیونکر ہوئی؟ قرآن میں آسمان کے لئے ہے "والسماءَ بنینٰھا باید" اور چوپایوں کے لئے ہے۔ "خلقنا لھم مما علمت ایدینا"۔ جواب یہ ہے کہ ان میں ید کی جمع فرمائی گئی ہے اور ایدینا میں جمع متکلم کی طرف نسبت و اضافت کی گئی ہے لیکن آدم کے لئے بیدیّ فرمایا۔ ید کو تثنیہ فرمایا اور اسے واحد متکلم کی طرف اضافت دی اس میں جو خصوصیت اور اہمیت ہے وہ ایدینا اور اید میں نہیں۔

باب سوم

تعلیم اسماء و شجرۂ ممنوعہ

۱- میرے نزدیک تعلیم اسما ایک نہایت مفصّل اور مکمّل تعلیم تھی۔ اس کے نصاب کے دو حصے تھے۔ ایک عام دوسرا خاص۔ نصاب عام، تعلیم نظری کے لئے تھا اور نصابِ خاص تعلیم عملی و تجربی کے لئے۔ نصابِ خاص کا تعلق علم آفاق سے تھا اور نصاب خاص کا علم انفس سے۔ نصابِ عام کی تعبیر علم اسماء و علمِ اشیاء سے کیجا سکتی ہے مگر نصابِ خاص کی علم اخلاق سے۔ نصابِ عام گویا علم تصرف تھا لیکن نصابِ خاص علم تصوف، نصابِ عام کا مفہوم تدریس تھا مگر نصابِ خاص کا تربیت۔ نصابِ عام گویا علم تکوین تھا لیکن نصابِ خاص علم تشریع مختصر یہ کہ نصابِ عام تعلیم دنیا تھی مگر نصابِ خاص تعلیم دین ۔ حکم سجدہ سے لیکر زمین پر حضرت آدمؑ کے نزول تک کے تمام واقعات سب کے سب آدمؑ کے لئے تعلیم اسما کا ہی دوسرا نصاب تھے۔ ملائکہ۔ آدم۔ ابلیس بھی چونکہ اسما تھے اور دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں نہایت اہم اور ذی عزت اشیاء و اسما تھے اور ان کے خواص بھی زیادہ اہم تھے اس لئے حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ نصابِ عام کی نظری تعلیم کے سلسلہ میں ان تینوں اشیاء و اسماء کی جو نظری تعلیم دی گئی ہے اسکے بعد انھیں تین اشیاء و اسماء کے خواص کی عملی تعلیم بھی حضرت آدمؑ کو دیدی جائے تاکہ انکا عملی تجربہ بھی ان کو ہو جائے اور یہ نصاب کارِ خلافت میں زیادہ مُعین ہوگا۔ میں نے جو اس نصاب دوم کی تعبیر نصابِ تربیت و اخلاق سے اوپر کی ہے تو اسی لئے کہ اس نصاب کی تعلیم کے دوران میں حضرت آدمؑ کو مختلف نفوس کی صلاحیت و استعداد، قلوب کے تقلّبات، احوال کے تغیّرات، ان کے آثار و خواص، غرض ان کے اخلاق بالتفصیل معلوم ہوئے چنانچہ حکم سجدہ کے بعد آپ کو

معلوم ہوا کہ:

۱۔ ملائکہ معصوم ہیں خدا کے حکم سے کام کرتے ہیں۔ نافرمانی یا ناگواری انکے اندر نہیں۔ پیکرِ خیر ہیں۔ خود نیک ہیں اور اتنے بابرکت ہیں کہ ان کے پاس آدم رہے تو اور بھی زیادہ معصومیت و حسنِ ظن پر عامل ہو گئے اور ابلیس رہا تو طاعت و عبادت ان سے سیکھ کر وہ بھی ملائکہ میں سمجھا جانے لگا۔ ان میں شر کا مادّہ ہی نہیں۔ یہاں تک کہ ابلیس نے ان کو آدم کے خلاف بہت کچھ سکھایا مگر وہ شر قبول نہ کر سکے۔

۲۔ آدم ممنوع کے حریص ہیں۔ انہیں نسیان ہے عصیان ہے۔ فریب خوردگی ہے۔ میل الی الاصل ہے۔ تاثر و انفعال ہے کہ ملائکہ کا فیضِ صحبت قبول کر لیا۔ ابلیس کی قسم سے متاثر ہو گئے۔ حسنِ خلق ہے کہ دشمن کی بھی دلشکنی نہیں پسند کرتے۔ عجلت ہے۔ اُنس ہے کہ دشمن سے بھی بیرخی نہیں کر سکتے۔ صدق اتنا کہ دوسرے کو بھی سچا سمجھتے ہیں۔ اخلاص ہے۔ حسنِ ظن ہے۔ اعتراف گناہ ہے ندامت ہے۔ توبہ ہے۔ حیا ہے۔ علم ہے۔ شہوت ہے۔ غضب ہے۔ تجربہ ہے اور شہوت و غضب ہی پر کائنات کی بنیاد ہے۔

۳۔ حوا میں مرد سے زیادہ تاثر ہے۔ مرد کو ترغیب دینا ہے اور اچھے خاصے مرد کو بے عقل اور بے خود بنا دیتا ہے۔

۴۔ ابلیس میں کبر و انانیت ہے۔ امتثالِ حکم میں اِبا ہے۔ حسد ہے آدم سے عداوت ہے۔ نفاق ہے۔ کذب ہے۔ حلفِ کاذب ہے۔ اصرار علی الاثم ہے۔ کفر ہے۔ تمرد ہے۔ حُبِ جاہ ہے۔ ریاءِ عبادت ہے۔ ریاءِ علم ہے۔

۲۔ عام طور سے حضرت آدمؑ کو اکلِ شجرہ پر عاصی (عرفی معنوں میں عاصی) سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال پختہ اس وجہ سے ہو گیا کہ خود حق تعالیٰ نے ان کے بارہ میں "عصٰے۔ غویٰ۔ نسیٰ۔ فتشقیٰ" وغیرہ الفاظ فرما دیئے ہیں تو بے احتیاط اور بے التفات لوگوں کو گویا "عصیانِ آدم" کے اعتقاد اور قول کی سند ہاتھ آ گئی استغفر اللہ۔ یقیناً قابلِ نفر

ہیں شعرا کے وہ اشعار جن میں سوئے ادب سے آدم کا ذکر ہو۔

اگہ آگاہ نۂ عالم درویشاں را تو چہ دانی کہ چہ سودا ست سر ایشاں را

حق تعالےٰ کے خطاب عتاب کو تو چھوڑ یئے کہ وہ خطاب ناز اور عتاب مالکانہ بھی ہو سکتا ہے۔ حق تعالےٰ کو خالق۔ مالک۔ ملک۔ رب۔ الہ۔ محبوب ہونے کے باعث سب کچھ کہنے کا حق ہے مگر آپ سوچئے کہ آپ کو وہ کلمات زبان پر لانے یا اُن کا اعتقاد رکھنے کا کیا حق ہے ؟ اگر حضرت آدمؑ کے فعل پر آپ کوئی حکم لگاتے ہیں تو یاد رکھئے کہ عقل و عدل کی نگاہ میں ان کے اکلِ شجرہ میں ذیل کے عذر بھی ملتے ہیں :۔

۱۔ یہ شریعت اور قانون کے مقرر ہونے سے یعنی نبوّت سے قبل کا واقعہ ہے۔ پس یہ نہی و ممانعت تشریعی نہ تھی جس پر معصیت فقہی کا اطلاق ہو سکے۔ یہ نہی تکوینی قسم کی تھی۔

۲۔ مفسّرین لکھتے ہیں کہ " اس حکم سے آدم کا امتحان مقصود تھا " شہوت (جس پر دنیا و آخرت کے منافع کے حصول کی بنیاد ہے) آدمؑ کے اندر پیدا کرنے کا فیصلہ حق تعالےٰ فرما چکے تھے (اسی طرح غضب جس پر دنیا و آخرت کی مضرتوں سے بچنے کی بنیاد ہے) بھی انکے اندر پیدا کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا اس لیئے کُلَا مِنۡهَا رَغَدًا کا امر تو شہوت پیدا کرنے اور فلا تخرجنکما من الجنّۃ کی نہی غضب پیدا کرنے کے لیئے تھی ان دونوں جذباتِ شہوت و غضب کا علم و تجربہ آدم کو دینا اور اس کے ساتھ آدمؑ کا امتحان کرنا اسی طرح ممکن تھا کہ کہ وہ ایک درخت کا پھل کھائیں تاکہ شہوت بھی اُبھر آئے اور اسی غلطی پر شیطان کے خلاف غصّہ بھی اُبھر آئے۔

۳۔ یہ اکلِ شجرہ اور ابلیس کا فریب کھانا جنت میں گزرا اور جنت دار العمل نہیں نہ پہلے تھی نہ آئندہ ہوگی۔ اس لیئے وہاں کے معاملات معصیت فقہی کیونکر ہو سکتے ہیں؟

۴۔ آدمؑ کے اندر حق تعالےٰ نے طلبِ علم اور تحقیق و تجسّس کا مادّہ بھی رکھا تھا اس مادہ کا فطری خاصہ ہے کہ جس چیز سے منع کیجئے اس کی تحقیق کی گویا اُسے کرسی

لگ جاتی ہے اور وہ اُسے ادا کرتا ہے۔ اس لئے آدم معذور تھے۔

۵۔ اللہ نے ایک طرف تو آدم کو اجزائے ارضی کے غالب حصہ سے پیدا فرمایا اور اُدھر انہیں اجزا سے بنے ہوئے پودوں سے جو آدم کے ساتھ زمین پر بھیجنے کے لئے جنت میں بہین (Nursery) کے طور پر لگا دیئے تھے دور رہنے کو بھی فرمایا ظاہر ہے کہ جب ایک اصل سے نکلی ہوئی دو چیزیں ایک دوسرے سے ملیں گی تو انہیں جذبِ باہمی کا قانون اپنا کرشمہ دکھائے گا اور دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچ کر رہیں گے۔ حق تعالیٰ نے بھی امتحان کرنے بلکہ آدم کو اس کا امتحان و تجربہ کرانے کے لئے منع فرما دیا کہ اُن کے قریب[1] بھی نہ جانا منشا یہ تھا کہ اگر یہ اُس کے قریب اُس دائرۂ اثر کے اندر پہونچ جائیں گے جو درخت کا ان[2] کو کھینچنے کے لئے اور ان کا درخت کو کھینچنے اور اُس سے ملنے کے لئے ہے یعنی جتنی دور اس کی کشش کام کرکے رہتی ہے تب تو مادہ اور اصل کی کشش ان کو اپنی طرف گھسیٹ کر رہے گی پس آدم و حوّا جیسے ہی اُن درختوں کے دائرہ کشش کے اندر پہونچ گئے پھر وہ اسی کشش ثقل سے بے قابو ہو کر رہ گئے تھے اور بے اختیار اس کی طرف کھنچ رہے تھے اور اللہ کی مشیت یہی تھی کہ دنیا میں جانے کا انتظام وہ خود کریں۔

حکایت۔ اکبر بادشاہ دودھ پینے ہی کے زمانے میں ماں سے چھوٹ کر چچاؤں کی قید میں چار پانچ سال رہا اس کے بعد ہمایوں کو واپس ملا۔ ہمایوں نے اُسے اس کی ماں سے اس طرح ملایا کہ کئی عورتوں کو عمدہ پوشاک پہنا کر ایک دالان میں بٹھایا اور سب سے کہہ دیا کہ کوئی کچھ نہ بولے پھر شہزادہ کو وہاں بلا کر کہا کہ ان میں جو تمہاری ماں ہوں انکی

---

[1] اسلئے میرے نزدیک لاتقربا سے اصالۃً بھی قربِ شجرہ ہی کی ممانعت تھی۔ مفسرین کرام نے جو یہ نکتہ فرمایا ہے کہ ممانعت اکل کی تھی اور قرب اس کا سبب بنتا اس لئے سبب سے بھی منع کر دیا جزاہم اللہ اچھا نکتہ ہے مگر ظاہر قرآن کے معنے اگر بن جاتے ہوں تو تاویل کیا ضرور؟ [2] جگدیش چندر بوس نے نباتات کے اندر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ بھی آپ کی طرف بڑھتا یا آپ سے دور ہٹتا ہے ۱۲

گود میں خود چلے جاؤ۔ اکبر دو قدم جا کر ٹھٹکا غور سے ایک ایک عورت کو دیکھا پھر اکبارگی ایک عورت کی طرف لپکا اور اس سے لپٹ گیا وہی حمیدہ بانو بیگم اس کی ماں تھی۔ قدرتی کشش اور اصل کی طرف میلان کا یہ عجیب واقعہ ہے یہی آدمؑ کے ساتھ ہوا پس وہ معذور تھے۔

۶۔ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ جنت میں دو قسم کے درخت تھے جنتی اور دنیوی۔ جنتی اصلی تھے اور دُنیوی بہین تھے اب یہ بھی سنئے کہ دونوں میں باہم مشابہت و مماثلت بھی تھی وہی مشابہت جس کا ذکر قرآن میں ہے کہ دُنیوی زندگی کے بعد جنت میں جا کر مومنین کو دنیا کے پھلوں سے ملتے جُلتے پھل ملیں گے اس لئے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ آدم کے سامنے بھی دونوں قسم کے درختوں میں مشابہت تھی اور اکل شجرہ بلا ارادہ اشتباہ میں ہو گیا۔

۷۔ رجل حازم یعنی اچھے خاصے سمجھدار آدمیوں کو بیخود اور بے عقل بنا دینے کی طاقت خدا نے عورت کو بخشی ہے جو حدیث سے ثابت ہے شعر و شاعری کی زبان میں یہی چیز "عکس دشنہ غمزہ جانستاں تیغ نگاہ بے پناہ" بنجاتی ہے حضرت آدمؑ پہلے شخص تھے جن کو اسی شجرہ کے معاملہ میں اس جانستاں اور بے پناہ چیز سے سابقہ پڑا اور "باندازہ فریب شہود" ان کو بھی بے خبر ہو جانا پڑا اور ماما حوا کی پیشکش اور ترغیب کے سامنے وہ بے اختیار ہو گئے۔ حضرت مجدد سرہندی اپنے شیخ کو لکھتے ہیں کہ "میں اس فرقہ کے سامنے آ کر بالکل بے بس اور ناطاقت ہو جاتا ہوں"۔ اور سید الاولین و الآخرینؐ فرماتے ہیں حُبب الیّ من دنیاکم الثلاث الطیبُ و النساء الخ

۸۔ ابلیس کے کہنے میں آدمؑ جو آ گئے تو اس کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ وہ حق تعالےٰ کی ممانعت کو ایک ہی معین شجرہ کے ساتھ مخصوص سمجھ گئے۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے ممانعت جو فرمائی تھی تو ایک پوری نوع کے تمام درختوں سے فرمائی تھی۔ یہ توجیہ طبعزاد ہی ہو یا ابلیس کی بتائی ہوئی ہو مگر بہت قرین عقل تھی ان کے اجتہاد میں یہ آیا کہ ایک مخصوص درخت کو جس کی طرف حق تعالےٰ کا اشارہ تھا چھوڑ کر بقیہ درختوں کے پھل کھانا ممانعت میں داخل ہی نہیں۔ پس یہ اجتہادی

غلطی ٹھہری اور معلوم ہے کہ مجتہدِ مخطی کو بھی ثواب ملتا ہے۔ کیسا مواخذہ اور کہاں کا عصیان !!

۹۔ ایک وجہ یہ ہوئی کہ ابلیس نے اپنی تلبیسات کے بارہ میں خدائے پاک کی قسم کھا کر کہا کہ میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں اور تمہاری خیر خواہی میں کہہ رہا ہوں۔ اب غور کیجئے آدم خود سچے تھے دوسروں کو بھی سچا سمجھتے تھے اوپر سے ملائکہ کی صحبت ملی چونکہ طبیعت بھی اخاذ اور جوہر بھی قابلِ فرشتوں کی معصومیت بھولے پن نیکی حسن ظن کے مزید اثراتِ صحبت سے اور بھی نیک ہو گئے تھے وہ تعلیم حق سے یہ جان گئے تھے کہ قسم کا سننے والے کو اعتبار کر لینا چاہئے۔ آپ کا قلبِ مبارک محبت حق میں سرشار تھا نام حق سنکر اس کی قسم کا اعتبار نہ کیسے کرتے؟ یہاں بھی اُن کے اجتہاد نے یہی فیصلہ کیا کہ قسم سننے کے بعد اس پر اعتبار نہ کرنا زیادہ بڑا گناہ ہے اس سے کہ کسی ممانعت کا ارتکاب کیا جائے اس لئے انھوں نے خدا کی عظمت کے سامنے دھوکے میں پڑ جانا آسان سمجھا۔

۱۰۔ اسی ضمن میں ان کو ابلیس کی دلشکنی ہوتی بھی نظر آئی جسے وہ برداشت نہ کر سکے وہ حق تعالیٰ کی صفت خلق و صنعت کو اس کے اندر دیکھ کر خدا کی عظمت سے ایسے مغلوب ہوئے کہ ان کی عالی ظرفی نے خود ممانعت کا مرتکب ہو جانا گوارا کیا مگر اس مخلوق خدا کی بھی دلشکنی کی ہمت نہ کر سکے گو وہ دشمن تھا خوب کہا ہے کسی نے ؎

به فیضِ عشق ز کونین صُلح کل کردیم　　تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

حکایت: ایک بزرگ کو رمضان میں دن کے وقت کسی نے کوئی چیز لا کر دی اور کہا کہ اسے میرے سامنے کھا لیجئے تاکہ مجھے کامل مسرت حاصل ہو انھوں نے غلبۂ حال میں اس کو تو گوارا کیا کہ توبہ کر کے دو ماہ کے مسلسل روزے رکھ لیں گے مگر اس کی دلشکنی گوارا نہ کی اور کھا لیا غرض۔ ان اعذار عشر کا خلاصہ یہ ہے کہ ؎

نہ من بر ز حکمت بدر می برم　　کہ حکمت چنیں می رود بر سرم

قضا و قدر اور مشیت کے دفتر کا حکم ہو چکا تھا کہ آدم گیہوں کھائیں تو آدم کے علم و حافظہ کو

بیکار ہونا پڑا حزم و حذر کو رخصت ہونا پڑا۔ تدبیر کو تقدیر کے آگے ہار ماننی پڑی۔ سر نیاز کو نازِ حسن کے سامنے جھکنا پڑا۔ وکان امرُ اللّٰہ قدرًا مقدورًا ○

بہرحال جب یہ احتمالات و اعتذارات ہوں تو حضرت آدمؑ کو عاصی گناہگار کہنا۔ سمجھنا۔ چرچا کرنا بڑی بے ادبی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بچائیں۔ رہا اللہ تعالیٰ کا ان کو "عصیٰ" وغیرہ فرمانا تو ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے محبت کی چھیڑ چھاڑ کے طور پر صورت معصیت اور ابہام عصیاں کو عصیٰ فرما دیا ہو تو حق تعالیٰ کو اسکا حق بھی ہے اور یقین ہے کہ آدم علیہ السلام نے بھی اس سے خوش ہو کر یہی فرمایا ہوگا کہ

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

مگر دوسرے کو ہرگز اسکا حق نہیں۔ پھر لطف یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ تو خود آدم کا عذر اس طرح بیان فرما رہے ہیں کہ "وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا" ہم نے اُن کی نیت غلطی کرنے کی نہیں پائی۔ پس جب صورت یہ ہو تو اب ہمارے لئے کیا مجالِ سخن رہ گئی؟

۳۔ اب ایک بحث یہ سامنے آتی ہے کہ کیا حضرت آدمؑ کا ستر کھل جانا اور پھر زمین پر اُتارا جانا گناہ کی سزا میں تھا؟ اکثر مفسرین کی عبارتوں سے مترشح کچھ ایسا ہی ہوتا ہے اور عام طور پر لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر مجھے اس سے اختلاف ہے میرے نزدیک جب پچھلی بحث سے یہ ثابت ہو چکا کہ ابلیس کی باتوں پر یقین کر لینا اور گیہوں کھانا دراصل انکے اجتہاد کی غلطی تھی اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے گناہ کرنے کا ارادہ آدمؑ کا نہیں دیکھا تو بحث ہٰذا بھی آپ سے آپ طے ہو گئی کہ یہ امور سزا میں نہیں تھے بلکہ یہ کسی اور وجہ سے ظہور میں آئے اور میری سمجھ میں وہ وجہ یہ ہے کہ:۔

حق تعالیٰ نے آدمؑ و حواؑ کو جب بشری حوائج اور انسانی تقاضوں کے ساتھ پیدا فرمایا تو اس کی حکمت و شفقت سے بعید تھا کہ اُن حوائج کے متعلق ان کو ضروری تعلیم نہ دی جائے اور طور طریقے نہ سکھائے جائیں۔ ماں باپ کو دیکھئے بچوں کو کھانا۔ پینا۔ ہگنا۔ موتنا حتیٰ کہ کسی چیز کی پسند اور کسی چیز سے نفرت کے انداز بھی بتاتے ہیں پس میرے خیال میں اللہ تعالیٰ

نے آدمؑ کو جنت میں بہت سی اشارتی تعلیمات بھی دی ہیں اور یہ سب تعلیمات کچھ تمثیل کے انداز میں معلوم ہوتی ہیں۔ ذیل کے واقعات پر غور کیجئے:۔

(الف) آدمؑ پیدائش کے بعد جنت میں تھوڑی دیر رہے پھر دنیا میں اُتار دیئے گئے یہ تمثیل اس کی معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں پیدا ہونے سے قبل انسان کچھ دنوں ماں کے پیٹ میں رہتا ہے پھر پیدا ہوتا اور دنیا میں آتا ہے۔

(ب) حضرت آدمؑ جنت میں کُلَا مِنۡهَا رَغَدًا کی تعمیل میں جو کچھ کھاتے تھے وہ ہی سب شجرۃ الخلد کے پھل تھے فرشتے وہی کھاتے تھے (ابن کثیر) اور دنیا کے بعد جنت میں جاکر تمام انسان بھی وہی کھائیں گے اُس میں مادّہ اور اجزائے ارضی نہیں کہ پاخانہ پیشاب کی حاجت ہو مگر جب مادہ اور اجزائے ارضی کے درختوں کا پھل آدمؑ نے کھایا تب ہی پاخانہ لگا۔ یہ میرے نزدیک اس کی تمثیل ہے کہ ماں کے پیٹ میں ایک خاص مدت تک بچہ ایک خاص غذا کھاتا ہے جس سے اس کو پاخانہ پیشاب کی حاجت نہیں ہوتی مگر جس دن اسکی غذا ماں کے پیٹ میں بدلتی ہے اسی دن سے اُس کے پیٹ میں پاخانہ پیشاب بنتا اور جمع ہونے لگتا ہے آخر وہی اس کے شکم مادر سے باہر آنے کا سبب بنتا ہے۔

(ج) آدم و حوّا علیہما السلام کے جسموں سے لباس جنت اتر گیا یہ میرے نزدیک ایک اشارتی تعلیم اور تمثیل تھی اس کی کہ احداث ثلاثہ (بول و براز و جماع) کے تقاضے کا وقت اب قریب ہے اس کے لئے تم کو لباس ہٹا کر ستر کھولنا پڑیگا۔ تم آئندہ ان تقاضوں کے وقت ستر کھولا کرنا۔

(د) دونوں نے ستر کھلنے سے قبل ایک دوسرے کا ستر (پردے کا جسم) نہیں دیکھا تھا۔ ستر کھلنے پر دیکھا یہ میرے نزدیک اس کی تمثیل تھی کہ بچوں کو ایک خاص عمر تک تو مرد و عورت کے جسمانی فرق جاننے اور سمجھنے کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا البتہ ایک خاص عمر میں جاکر اس کے ابتدائی ادراکات شروع ہونے لگتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے کہ "بچے جب دس برس کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر ان کو مارو اور لیٹنے میں ایک کو دوسرے سے الگ رکھو۔

۴۔ اسی طرح ایک دوسری بحث یہ سامنے آتی ہے کہ اکثر مفسرین کرام رحمہم اللہ نے حضرت آدمؑ کے زمین پر اُتارے جانے کو شقاوت اور گندم خوری کی سزا بتایا ہے۔ میرا خیال یہ نہیں ہے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ بفرضِ محال، حضرت آدمؑ شجرہ ممنوعہ کا پھل نہ بھی کھاتے جب بھی وہ دنیا میں یقیناً اُتارے جاتے۔ حق تعالیٰ کی مشیت اور تقدیر یوں ہی تھی کہ آدمؑ کے دُنیا میں آنیکا سبب گیہوں کھانا ہی ہو اُس میں اور بھی بہت سی حکمتیں تھیں اس لئے یہ تو محال تھا کہ وہ گیہوں نہ کھاتے لیکن ایک تو چونکہ ان کی خلافت بحکم جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً زمین ہی میں ہونے والی تھی دوسرے وہ خاک ہی سے بنے تھے اس لئے آنا تو ان کو بہر حال اسی زمین پر تھا اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ گیہوں نہ کھاتے تو کسی اور صورت سے سہی مگر آتے اسی دنیا میں۔ چونکہ مادّہ والے درختوں کے پھل کھا چکے تھے اور شکم میں احداث کے ابتدائی احساسات اور تقاضے ان کو محسوس ہو بھی رہے تھے۔ اس کا علم خدا کو تھا اس لئے حکم ہوا اھبطوا یعنی یہاں سے نیچے جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کو زیادہ تقاضا محسوس ہوا تو پھر حکم ہوا اھبطوا منھا جمیعاً۔ بس اب جلد تم سب کے سب یہاں سے اترو ورنہ اب جو حال تم کو پیش آئیگا اس کے انتظامات ہم نے یہاں نہیں رکھے زمین میں رکھے ہیں۔ آدم کو اھبطوا جو فرمایا تو اس مذکورہ وجہ سے لیکن ابلیس کو جو یہ حکم دیا تو اس لئے کہ یہ جگہ متکبر نافرمان منکر کیلئے نہیں ہے تو بھی یہاں سے اُتر۔

ادھر ابلیس کی چال اس میں یہ تھی کہ آدم اتریں گے تو بہر حال زمین ہی پر لیکن نہ معلوم کتنے عرصہ تک یہ یہاں کے عیش و آرام میں رہیں۔ نہ معلوم علم الٰہی میں ان کے نزول کی کون سی ساعت ہے؟ تو میں اگر جنت کی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہوں تو کیا اُن کو میں جنت میں عیش کرنے دوں گا؟ نہیں۔ جو ڈوبا ہوں تو آدم کو بھی لے ڈوبونگا ایک بات تو یہ تھی دوسرے

اُس کے دل میں جلدی اس کی بھی تھی کہ ذرا یہ آدمؑ گوشۂ جنت سے نکل کر میدان میں تو نکلیں تو میں ان سے وہاں دو دو ہاتھ کروں۔ تیسری چال وہی تھی کہ خدا اُن سے بھی ناراض ہو جائے اور ان کو اپنی رحمت سے دور کر دے۔ یہ تین اغراض شیطان کی تھیں ان میں سے تیسری تو یوں ملیامیٹ ہو گئی کہ وہ توبہ کی بدولت مجتبیٰ اور صفی ہو گئے۔ دوسری غرض میں بھی اسے ناکامی ہی ہوئی کیونکہ دنیا میں آتے ہی آدمؑ پیغمبر بن گئے اس طرح عام انسانوں سے بہت زیادہ فرشتے ان کی حفاظت پر تعینات ہو گئے۔ تیسری غرض میں بھی وہ یوں ناکام رہا کہ وہ اور اُن کی بہت سی اولاد نیک راہ پر چل کر جنت میں پھر پہونچے گی گویا "اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطَانِ کَانَ ضَعِیْفاً" اُس نافرمان (ابلیس) کی چالیں ہمیشہ بودی ہی رہیں کا ارشاد صادق آیا۔

البتہ اُسے اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ اس نے حضرت آدمؑ کو ایک وقت مقدرہ سے کچھ پہلے (مگر دوسرے[1] وقت مقدرہ ہی پر) زمین پر اتروا دیا۔ یہ تو ہے میرے نزدیک اصل صورت حال۔ لیکن چونکہ اس کے تذکرہ میں قرآن میں "فتشقٰی" آیا ہے یا حدیث معراج میں محاجۂ آدمؑ و موسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام میں جو شقیت و اشقیتنا کے الفاظ آ گئے ہیں تو اس سے بے علم و بے احتیاط لوگ برابر اس قسم کے جملے منہ سے نکالتے رہتے ہیں کہ" بابا آدمؑ نے بڑی غلطی کی خود بھی گیہوں کھا کر مصیبت میں پھنسے اور ہم سب کو بھی پھنسا دیا نہ وہ گیہوں کھاتے نہ ہم اس عذاب میں مبتلا ہوتے مزہ سے جنت میں آرام کرتے۔" وغیرہ وغیرہ نعوذ باللہ۔

---

[1] تقدیر تین قسم کی ہوتی ہے ایک ابرم مثل قیامت کا آنا۔ یہ ضرور آئے گی جس وقت پر خدا نے اس کا آنا لکھا ہے اسوقت آئے گی اگر تمام فرشتے۔ انبیاء۔ صلحاء۔ جنّ بھی ملکر بالفرض دعاء درخواست کریں کہ وہ ٹل جائے مگر نہ ٹلے گی۔ دوسری مبرم جو عام اسباب کے ماتحت نہ ہو۔ عام اسباب سے تو نہ ٹلے لیکن خاص سبب سے جو اللہ نے مقرر کیا ہے جو اتفاقی و خوش قسمتی ہی سے میسر آتا ہے۔ ٹل جائے مثلاً کسی مقرب بزرگ بندہ۔ پیغمبر کی دعا وغیرہ۔ تیسری معلق اور مشروط جو عام اسباب کے ماتحت ہو۔ یہ تقدیر معلق اسباب کے بدلنے سے ٹل جاتی ہے۔ نفس نزول آدم تو تقدیر ابرم تھی مگر اسکا وقت تقدیر معلق تھا کہ اگر گیہوں کھالیں گے تو (مثلاً) یکم محرم کو زمین پر اتار دیئے جائیں گے اگر نہ کھائیں گے تو (مثلاً) ۱۰ محرم کو۔ حدیث میں جو عمر و روزی کا گھٹنا بڑھنا آیا ہے تو وہ سب اسی قسم کی تقدیر ہے اور اس کے اسباب بھی حضورؐ نے ارشاد فرمادیئے ہیں واللہ اعلم

میں ایسے لوگوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ ایسا کہہ کر وہ کئی غلطیوں اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں:۔

۱۔ حضور کا ارشاد ہے کہ "کاش اور اگر کے الفاظ بولنا (کاش ایسا ہوتا اگر ایسا نہ ہوتا) شیطان کے بہکانے کا راستہ کھولنا ہے یعنی ان الفاظ کی زد تقدیرات الٰہیہ پر پڑتی ہے اس لئے ان سے بچنا چاہیے۔

۲۔ تشقی وغیرہ کا مفہوم عربی میں وہ نہیں ہے جو اردو میں ہو گیا ہے پس قرآن وحدیث میں اس مادہ کے آجانے سے آپ کو اجازت نہیں مل گئی ہے کہ قرآن وحدیث کی عبارتوں میں ان کا مفہوم وہ لیں جو آپ نے اردو میں اختراع کر لئے ہیں۔ اردو میں اس کا مفہوم "بدبختی۔ نافرمانی۔ سنگدلی۔ سرکشی اور سوء خاتمہ" وغیرہ کے ہیں لیکن عربی میں اسکا مفہوم بہت سادہ ہے "بکھیڑے میں پڑ جانا۔ دردسر اور فکر میں مبتلا ہونا" قرآن میں خدا نے یہ فرمایا کہ "آدم دیکھو یہاں جنت میں تم کو خود کھانے پہننے رہنے کی کوئی فکر نہیں کرنی پڑتی۔ یہاں سے نکلتے ہی تم کو نون تیل لکڑی کے انتظامات خود کرنے پڑ جائیں گے"۔ حدیث میں حضرت موسیٰ نے بھی یہ لفظ انہیں معنوں میں بولا ہے۔

۳۔ قرآن وحدیث کے یہ الفاظ شقاوت (بہ الفاظ دیگر) تعبیرات ہیں حسب ذیل کلمات قرآنی کی۔ ایک جگہ فرمایا "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ" "ہم نے انسان کو پیدا ہی کیا ہے مشقت میں رہنے کو" دوسری جگہ فرمایا اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا اے انسان تو رب سے ملنے کے وقت تک کام میں کوشش کرتا رہیگا۔ مطلب ان دونوں بلکہ تینوں تعبیرات کا یہی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان اس عالم اسباب میں آکر حکم کے مطابق اپنی روزی الگ پیدا کرے۔ حکم کے مطابق مکان رہنے کے لئے الگ بنائے۔ حکم کے مطابق پہننے کا لباس الگ خود تیار کرے۔ حکم کے مطابق ہی رہن سہن۔ دوستی دشمنی۔ لین دین کرے۔ یہ سب اسے کرنا پڑے گا۔ بیکار نہیں رہ سکتا۔ یہی امانت اس نے اپنے سر لی تھی کہ عمل کرونگا اور اس میں عدل کرونگا پھر بھلا امانت۔ حکومت۔ ادائے حقوق۔

ادائے فرائض بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ بغیر دردسری مول لئے بغیر فکر اور بکھیڑے میں پڑے ممکن کب ہے؟ امانت اور خلافت کو ادا کرنے کے یہ معنے کہاں سے نکلتے ہیں کہ بیفکر ہو کر ہاتھ پاؤں ڈھیل کر آنکھیں بند کرکے اور اپنے لذّات میں منہمک رہ کر خلافت کرو اور امانت ادا کرو۔ پھر جب معلوم ہو گیا کہ یہی بکھیڑے یہی تعلقات اور یہی تردّدات ذریعہ ہیں قربِ حق کا۔ ادائے امانت کا۔ اجرائے خلافت کا۔ تو آدمؑ اگر گیہوں نہ بھی کھاتے جب بھی یہ تردّدات اس عالم اسباب میں ان کو پیش آکر رہتے تو پھر آدمؑ کا زمین پر آنا شقاوت (اردو کے مفہوم میں) کیونکر ہوا؟ یہی تعلقات تو آدم اور اولادِ آدم کے لئے مرآۃِ جمالِ الٰہی بنے۔ انھیں کی بدولت تو آدمؑ اور آدمزاد پر بہت سے اسمأ الٰہی کی معرفت اور قدرت الٰہی کی کمالِ معرفت کھلی۔ اگر آدم و آدمزاد جنت ہی میں رہتے دنیا میں نہ اترتے تو یہ بھی فرشتے ہوتے مگر ان کی معرفت ناقص رہتی پھر جنت کی قدر جو بعد مشقت اٹھانے ہی کے بہتر طور پر ممکن ہے کیونکر ہو سکتی؟ آخر جنت میں وہ کارِ خلافت کس طرح انجام دیتے؟ کیا اولاد آدم کا سلسلہ اور نسل جنت ہی میں چلتی؟ کیا دارالعمل دنیا میں ان کو بھیجے بغیر انبیا علیہم السلام کے مبارک سلسلہ کا آنا ممکن تھا؟ کیا دوزخ کو پیدا کرنا بیکار تھا؟ کیا کچھ اولاد آدم کو بغیر ارتکاب سیئات کے محض حق تعالیٰ کے علم ازلی کی بنا پر دوزخ میں بھیج دیا جانا عدل ہوتا؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ آدمؑ کا دنیا میں آنا تو ایک ازلی تقدیر تھی اس لئے وہ گندم خوری کی سزا نہیں ہو سکتی۔ ہاں بس یہ ہوا کہ ابلیس نے ان کو زیادہ دیر آرام اٹھانے نہیں دیا۔ حق تعالیٰ نے جہاں فرمایا کہ ابلیس نے ان کو نکلوا دیا وہاں میرے نزدیک یہی مراد ہے کہ وقت سے کچھ پہلے نکلوا دیا۔ والحمد للہ علیٰ ھٰذا العلم۔

باب چہارم

برکات آدم

یا

آرائشِ عالم میں حضرت آدمؑ کا حصّہ

یہ دراصل حضرت آدم علیہ السلام کی تکریماتِ ہفتگانہ میں سے آخری مگر نہایت اہم تکریم ہے اس کا دوسرا عنوان "افتتاحِ تدیّن و تمدّن" بھی ہے۔ اگر معاملہ صرف تدیّن کا ہوتا تو آدم کے لئے مثل ملائکہ کے اس بار کا اٹھا لینا سہل ہوتا بلکہ شاید اس صورت میں آدم نام کی ایک نئی مخلوق پیدا کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی تھی کیونکہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں۔ اسی طرح معاملہ اگر صرف تمدّن اور دنیا داری کا ہوتا تو حیوانات کی طرح اس کی بھی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا آسان تھا مگر یہاں تو دوگنا بار ان کو اُٹھانا تھا اور دوہری ذمہ داریاں تھیں جن کا حق خود ان کو اور اُن کی ذریّت کو ادا کرنا تھا اور دونوں ہی اہم ذمّہ داریاں تھیں۔ ایک دوسرے کی ضد تھیں اور حکم یہ تھا کہ دونوں کو بیک وقت اُٹھاؤ۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ یہ صرف دردِ سر نہ تھا دردِ جگر بھی تھا۔ اس میں آگ اور پانی کو جمع کرنا تھا مگر اس شرط کے ساتھ کہ نہ آگ بجھے اور نہ پانی جلے۔ یہ جام و سنداں سے کھیلنا تھا مگر اس احتیاط سے کہ دونوں کو برابر

ٹکرایا بھی جاتا رہے اور جام بلوریں میں بال بھی نہ پڑنے پائے۔ یہ قعرِ دریا میں تہ نشین ہونا تھا مگر یہ کمال بھی دکھانا تھا کہ سرِ دامن بھی تر نہ ہونے پائے اور پھر واقعی یہ کارنامہ اور کار نمایاں ہی ہے اُس لشکرِ انسانیت کا جس کے سپاہ سالارِ اعظم تو حضرت سرورِ عالم رحمتِ مجسّم احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور طلایہ کے کماندار حضرت ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام تھے اور انھیں بزرگوں کی برکت سے یہ "ہفتخوانِ امانت وخلافت" کی مہم سر اور نفس وشیطان کی فوج پسپا ہو سکی پھر یہ نورِ عالم افروز ہی تھا اُس ضحوۂ دین وشریعت کا جس کے نیرِّ اعظم تو حضرت سرورِ کائنات، مُفخرِ موجودات رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم تھے مگر اس کی صبحِ صادق حضرت ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام تھے۔ یہی تجلیاں تھیں جن سے مظلم اور خاکی نفوس کی ظلمتیں دُور ہو سکیں۔

حضرت آدمؑ نے دنیا میں تشریف لاکر ایک طرف تو اِس خاکدانِ عالم میں اُس کتاب تدیّن کی بسم اللہ کی جس کی تمت نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا طُرۂ کمال یہ آیت "الیوم اکملتُ لکم دینکم واتممتُ علیکم نعمتی" بنی۔ اور دوسری طرف آپ نے اس ویرانہ میں اس تمدّن کی داغ بیل ڈالی جس کے مینار وگنبد آج چودہویں صدی کی ترقی یافتہ والی دنیا کی دلکشیاں۔ ایجادیں، تعمیریں اور آبادیاں ہیں جو بہتوں کو ان کے آبائی گھر اور موروثی وطن جنّت سے بھی غافل اور بے نیاز بنائے ہوئے ہیں۔ کسی جنگل یا بنجر میں کوئی بنیا پڑی ہو یا کوئی پگڈنڈی پہلے سے بنی ہو تو اس پر تو ہر کوئی چل سکتا ہے لیکن جس حیرتکدۂ علائق میں نہ کوئی نشانِ راہ ہو اور نہ آثارِ رفتگان، اس راہ پر چلنا دراصل چلنا ہے تقلید واتباع بہت آسان ہے مگر تشریع واجتہاد بہت مشکل۔ مقتدی تو امام کے پیچھے بے التفات رہ کر اور زبان بند کر کے بھی نماز پوری کر سکتا ہے مگر مشکل دراصل امام کی ہے کہ اپنے ساتھ تمام مقتدیوں کی نمازوں کا بوجھ بھی اُس کی گردن پر ہوتا ہے۔ حضرت آدم نے تدیّن اور تمدّن دونوں تک پہونچانے والے راستے خود بنائے اور بعد والوں کے لئے مشکلات کی راہ صاف کر گئے

خوب کہا ہے غالب دہلوی نے ؎

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم سوخت
منّتے بر قدمِ راہرو انست مرا

حضرت آدمؑ دنیا کے پہلے انسان بھی ہیں اور پہلے رسول بھی۔ عقلِ سلیم تقاضا کرتی ہے اور نقلِ صحیح اس کی تائید و تصدیق کہ اگر ان کے ذمّہ افزائشِ نسل کا کام تھا تو پھر نسل کو دنیا و آخرت کی صحیح راہ دکھانے اور جسم و روح دونوں کے حفظ و بقاء و ارتقاء کا طریقہ سکھانے کا کام بھی انھیں کے ذمہ تھا اور اس کام کو انھوں نے بوجہِ احسن انجام دیا چنانچہ آج دنیا نے تمدن یا تدیّن کے راستہ میں جتنی بھی ترقیاں کی ہیں وہ اگرچہ انسان کے تغیّر پذیر مزاج اور ترقی پسند طبیعت کو دیکھتے ہوئے ناگزیر تھیں یعنی وہ تو ہوتیں اور ضرور ہوتیں مگر آج کے تمدن و تدیّن کے دونوں سر بفلک قلعہ ہائے زندگی کی بنیادی اینٹ تو حضرت آدمؑ ہی نے رکھی ہے !!

ہم ذیل میں حضرت آدمؑ کی برکات اور اوّلیات اپنی معلومات کی حد تک گنا کر دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ آرائشِ عالم میں اُن کا کتنا حصّہ ہے اور ہم دنیا والوں پر ان کا کتنا زبردست احسان ہے ؟ یہاں اس حقیقت کو ایکبار پھر ذہن نشین کر لیجئے کہ حضرت آدمؑ پر دو قسم کی وحی نازل ہوتی تھی ایک تدیّن اور احکام آخرت کے متعلق اور دوسری تمدّن اور احکام دُنیا کے متعلق یعنی آخرت کے احکام جس طرح جبرئیل علیہ السلام دوسرے پیغمبروں پر لاتے تھے اسی طرح اسلام کے ابتدائی احکام حضرت آدم پر بھی لائے لیکن حضرت آدم پر تمدن کے لوازم مثل زراعت، حیاکت، خیاطت، عمارت کے متعلق بھی خدا کی طرف سے احکام آتے تھے اور ان پر عمل کرنا بھی اسی طرح فرضِ عین، عبادت اور موجبِ قربِ حق اور موجبِ ثواب تھا جس طرح مثلاً نماز پڑھنا اور یہ صورت دس پشتوں تک (عہدِ نوحؑ تک) رہی۔

ملہ آیت انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح الخ سے یہی اشارہ نکلتا ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی اس قسم کی تھی جو نوح اور بعد کے پیغمبروں پر آئی مگر اس قسم کی نہ تھی جو قبل نوح کے پیغمبروں آدم شیث ۔ ادریس وغیرہم علیہم السلام پر اتری۔ قبل نوح کی شریعتوں میں تمدن کے امور فرض عین تھے۔

قسم اول تدیّن :۔

۱۔ آپ مسلم تھے آپ کا دین اور آپ کی تعلیم سے آپ کی اولاد کا دین اسلام تھا۔ آپ کا کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ آدمُ صفیُّ اللّٰہ تھا علیہ السلام۔ خدا پر۔ فرشتوں پر۔ آئندہ پیغمبروں پر خاص کر حضرت نبی آخر الزماں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ آئندہ کی کتبِ آسمانی پر۔ قیامت وما بعد القیامۃ پر ایمان آپ کا مذہب تھا۔

۲۔ آپ نے فجر کے وقت دو رکعت نماز نفل شکر پڑھی خدا نے آپ کی امت پر اور بعد والوں پر ایک وقت (فجر) کی نماز فرض کی۔

۳۔ آپ نے ایامِ بیض کے نفل روزے رکھے (میرا قیاس ہے کہ آپ کی شریعت میں یہی روزے فرض بھی ہو گئے ہوں گے)

۴۔ آپ نے اپنی امت (ذریت) کو قربانی کا حکم دیا۔ [زکات کی ضرورت نہ تھی]

۵۔ آپ نے خدا کے اشارہ سے حضرت جبرئیل کی مدد سے سب سے پہلا مکان مکہ میں بنایا اور اس کا نام کعبہ رکھ کر خدا کی عبادت کے لئے مخصوص کر دیا۔

۶۔ آپ نے حضرت جبرئیل کی تعلیم سے کعبہ کا طواف کیا۔ یہی اُس شریعت کا حج تھا۔

۷۔ آپ نے علم تصوّف و احسان کی بنیاد ڈالی۔ نفس کے کیوداور تقلبات کا علم "تعلیم اسما" کے سلسلہ میں براہ راست حضرت حق جَلّ جلالہٗ سے حاصل کیا اور اس کو اپنی اولاد کو بھی سکھایا گیا۔ توبہ۔ حسنِ ظن وغیرہ آپ کے مقامات عالیہ تھے۔

۸۔ آپ نے حضرت حق جَلّ جلالہٗ سے تعلیم اسما میں اس طرح علوم سیکھے کہ پھر انکے مقابلہ میں ملائکہ کو بھی اپنی کمی کا اقرار کرنا پڑا۔ علم کے باعث آپ کو ملئکہ نے سجدہ کیا جس سے علم دین کا درجہ عبادات و مراقبات سے اور انسان کا درجہ فرشتوں سے بڑھ گیا۔

۹۔ آپ نے اپنی امت کو بلکہ تمام بنی نوع کو ان کے جانی دشمن سے ہوشیار کر دیا اور اعمال تدیّن و تمدن کی بنیاد ڈال کر تمام بنی نوع کو ہدایت کی کہ زندگی کسالت و

بطالت میں نہ گزاریں۔ عمل میں مشغول رہیں تو دشمن سے بچے رہیں گے۔

۱۰۔ آپ نے حسن معاشرت کی بنیاد ڈالی چھینک پر الحمد للہ اور اسکا جواب یرحمک اللہ اور سلام اور اس کا جواب دنیا کو بتایا اور دین میں معاشرت بھی داخل ہے۔

۱۱۔ آپ کے عہد میں شہید کو بے غسل دفن کیا گیا اور آپ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔ آج شہید کے یہ احکام آپ ہی کی شریعت کے یادگار ہیں۔

۱۲۔ آپ نے سب سے پہلے جنسی تعلقات کا صحیح حل نکالا کہ مرد و عورت میں ناجائز تعلق نہ ہو بلکہ خدائی قانون نکاح کو ابتدا ار انسانیت ہی سے جاری کیا۔

قسم دوم تمدّن :۔

۱۔ آپ نے خدا سے حکم اور تعلیم پا کر زمین جوتی۔ آپ پہلے شخص ہیں جس نے زمین جوتنا۔ غلّہ بونا۔ کاٹنا اور کھانا دنیا کو بتایا۔ اسی طرح کپڑا بُننا۔ اُسے سینا دنیا کو آپ ہی نے بتایا۔

۲۔ آپ کے عہد میں پہلی انسانی لاش مٹّی میں چھپا دی گئی۔ مٹّی کے پُتلے کو مٹی ہی میں ملا دیا گیا۔ انسانی لاش کے ساتھ یہی برتا دُ خدا کو پسند تھا۔

۳۔ آپ کے ذریعہ پہلے پہل مردہ کو نہلانے اور کفن دینے کا طریقہ دریافت ہوا اور آج تک جاری ہے۔

۴۔ آپ پہلے شخص ہیں جس نے مل جل کر اجتماعی زندگی گزارنا دنیا کو سکھایا۔ نکاح بیاہ کے ذریعہ گھرانے۔ قبیلے۔ خاندان کا بنیادی تصور آپ ہی نے لوگوں کو سکھایا۔

۵۔ آپ نے تعلیم اسمائیں خدا سے حروف ہجا (Alphabet) سیکھ کر دنیا کو سکھائے اور اب وہی ساری دنیا کی زبانوں کی اب ت یا الفابت بنے ہوئے ہیں اسی طرح جملہ علوم بھی آپ نے خدا سے سیکھے۔

۶- آپ نے خدا سے تمام زبانیں سیکھیں- خود آپ کی زبان عربی تھی اس لئے کہ آپ کے وطن جنت میں یہی زبان رائج تھی اور مرنے کے بعد عالم قبر میں اور پھر جنت میں یہی عربی زبان رائج رہے گی۔

۷- آپ نے دنیا میں آنے سے بھی پہلے سے یعنی جنت میں اپنی شرمگاہ چھپائے رکھی۔ آپ کبھی برہنہ نہیں ہوئے- آپ مہذب تھے- شرمگاہ چھپانے کا دستور دنیا میں آپ ہی کی یادگار ہے۔

۸- آپ نے دنیا میں پہلے پہل دن کے مختلف حصے (صبح- دوپہر- سہ پہر- شام- رات) ہفتہ کے سات دن (اور اس میں جمعہ کی فضیلت) سال کے بارہ مہینے اور ان میں محرم و رمضان کی خاص فضیلت بتائی- غرض تقسیم اوقات اور تقویم شہور و سنین کا ابتدائی تصور دنیا کو آپ ہی نے عطا فرمایا۔

الحمد للہ و بنعمتہ تتم الصالحات- اللّٰھم صلّ علیٰ ابینا آدم و نبینا محمد و علیٰ اخوانہ الانبیاء و اصحابہ الاصفیاء و بارک و سلم و اغفر لمولفہ محمد سراج الحق وکن لہٗ

دوشنبہ ۳ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ
۶ اگست ۱۹۶۲ء

مسلم بورڈنگ الہ آباد

باسمہٖ سبحانہٗ ۔ الحمد للہ و استغفر اللہ

فسانۂ آدم

۱۔ چشمم کشود ۔ دیدم عالم فسانہ بود
موجود حُسن و خالی ز عشقش زمانہ بود!

۲۔ مقصودِ آں، نظر بخود و شغلِ ایں، نماز
کارے بجز "نظر بہ جمالش" مرانہ بود

۳۔ از نور و نار آں ہمہ ۔ و ز خاکِ پست من
گشتم فدائے آں کہ خدائے یگانہ بود

۴۔ در لوحِ بُد "ظلوم یکے مجتبےٰ" شود
زیں چیستانِ راز، کسے آشنانہ بود

۵۔ از خِنّتے کہ وادیِ ایمن بمن بدا است
برقے تپید ۔ و آہ! ۔ کششِ بیکرانہ بود

۶۔ قرباں شدم بہ حُرمتِ سوگند نامِ حق
یاراں! بس ایں حقیقتِ گندم فسانہ بود

۷۔ بے خود ز غمزہ اش بہ دویدم بہ "آں شجر"
صد خیر را ہمیں گنہم آشیانہ بود

۸۔ لغزش کہ یار خواستہ، بہتر ز بندگیست
مقصود بُد نوازش و لغزش بہانہ بود

۹۔ او خواست تا ز دامِ انابت کشد مرا
گندم، پئے خلافتِ ارضیش دانہ بود

۱۰۔ واہم نہ بود سرکشم! از یارِ خود!! بہ خلد!!!
کرد آں چہ خواست محرمِ "ازاں یگانہ" بود

۱۱۔ دیدم بہ "لوح" رفتنِ موسیٰ بہ یک درخت
واں رفتنش برائے نبوت بہانہ بود

۱۲۔ معراجم از نزول و ز "شجرہ" نبوتم
و ز بہرِ قہرِ نفس، خطا، تازیانہ بود

۱۳۔ معراج، نے ہمیں کہ محمدؐ بہ عرش رفت
آخر نہ یک عروج بہ "ماہی دہانہ" بود

۱۴۔ صدرہ "نزول" بہ ز عروجِ غرور و ناز
کاں مایۂ "نیاز" بداں آستانہ بود

۱۵۔ نوری و سجدہ پیشِ ظلومے! ازیں شگفت!!
کس را مجالِ عرض، دریں "اجتبا" نہ بود

۱۶۔ از خاک و باد و آتش و آب و پری و جن
موزوں "ہمیں گدا" پئے "تاجِ شہانہ" بود

۱۷۔ از کشتگانِ قہرِ شہ ۔ شکر کن سراج
خود بیں مباش ۔ ناز کسے را روانہ بود

مصنّف رسالہٰذا کی

ایک قابل قدر نادر اور اہم تالیف

جمعہ کے عربی خطبے

موسومہ

خُطَبُ العِرفَانِ مِن شُعَبِ الاِیمَانِ

مع مقدمہ

امام بیہقیؒ کی شعب الایمان کے بعد (جو آج ناپید ہی) احادیث شعبہ ہائے ایمانیہ کا ایک ایمان افروز مجموعہ۔ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق اسلامی تعلیمات صحیح اور کامل اسلام کے حدود بتلانے والا چھ سو احادیثِ نبویہؐ کا مفید ذخیرہ۔ اس میں سال بھر کے لئے جمعہ کے خطبے انھیں احادیث شعب الایمان سے تیار کئے گئے ہیں۔ نیز حضرات صحابہؓ اور اہلبیتِ رسولؐ کی حرمت کو بہت اُجاگر کیا گیا ہے۔ ہر ماہ کے اعمالِ مسنونہ کی ترغیب اور بدعاتِ مروجہ کی تردید بھی کی گئی ہے۔ مقدمہ میں جمعہ کی وجہ تسمیہ۔ تاریخ نماز جمعہ و خطبہ جمعہ۔ نیز خطبہ کا لہجہ، عدد اور مضمون اور خطبہ کی زبان و مقدار وغیرہ کے متعلق صحیح و پرمغز معلومات، فقہ کے تحقیقی احکام۔ نکاح خوانی کے اور مرد کے مظالم سے عورتوں کو نجات مل سکنے کے بعض مسائل کے ذکر نے اس کی افادیت بہت بڑھادی ہے۔

زیر طبع ہے اور انشاء اللہ بہت جلد نظر افروز ہوگا۔

ائمۂ مساجد۔ تبلیغ کے شائقین۔ عشاقِ سنّت۔ طالبان حدیث کیلئے بہترین کتاب ہے۔

ناشر:۔ عبد العلیم عیسٰی پسر مصنّف

جمیدی پریس الہ آباد۔